اسرائیل، عالم اسلام اور پاکستان

www.KitaboSunnat.com

نگارشات:

مفکر اسلام ابو عمار مولانا زاہد الراشدی زید مجدہ

جمع و ترتیب:

مفتی محمد سعد سعدی

ناشر:

پاکستان شریعت کونسل راولپنڈی

بسم اللہ الرحمن الرحیم
قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ
مجلس التحقیق الاسلامی کے زیر اہتمام
محدث لائبریری
کتاب وسنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

معزز قارئین توجہ فرمائیں

- کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب... عام قاری کے مطالعے کیلئے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق واجازت کے بعد (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کیلئے ان کتب کو ڈاؤن لوڈ (Download) کرنے کی اجازت ہے۔

تنبیہ

ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کیلئے استعمال کرنے کی ممانعت ہے
کیونکہ یہ شرعی، اخلاقی اور قانونی جرم ہے۔

اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھر پور شرکت اختیار کریں

PDF کتب کی ڈاؤن لوڈنگ، آن لائن مطالعہ اور دیگر شکایات کے لیے درج ذیل ای میل ایڈریس پر رابطہ فرمائیں۔

KitaboSunnat@gmail.com
library@mohaddis.com

www.KitaboSunnat.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قبلہ اول بیت المقدس سے وابستگی اور قلبی تعلق ہر ایک مسلمان کا ایمانی تقاضا ہے اور اس مقدس مسجد پر آئے روز صیہونی اَفواج کی چڑھائی اور پامالی یقیناہر ایک مسلمان کے لئے نا قابل برداشت اور دل گیر عمل ہے۔ مسجد اقصیٰ سے اپنے قلبی جذبات کے اظہار کے ساتھ ساتھ اس مسئلے اور جھگڑے کی اصل نوعیت اور اس کے بنیادی مقاصد و عناصر کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اس مسئلے کی تفہیم کے لئے ذیل میں عالم اسلام کی عظیم شخصیت مولانازاہد الراشدی صاحب زید مجدہ کی تحریرات کو پیش کیا جارہاہے جو امید ہے کہ قارئین کے لئے نفع مند ہو گی۔

از مرتب

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

مسئلہ فلسطین کا تاریخی پس منظر اور عالم اسلام کا اصولی موقف:

مجلہ :

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد

تاریخ اشاعت :

۸ مارچ ۲۰۰۲ء

اصل عنوان :

شہزادہ عبد اللہ کی تجویز اور عالم اسلام کا اصولی موقف:

سعودی عرب کے ولی عہد شہزادہ عبد اللہ کی اس تجویز پر دنیا بھر میں بحث و تمحیص کا سلسلہ جاری ہے کہ اگر اسرائیل عربوں کے مقبوضہ علاقے خالی کر دے تو سعودی عرب اسے تسلیم کرنے کے لیے تیار ہے۔ شہزادہ عبد اللہ کی پیشکش عرب اسرائیل سیاست میں ایک اہم پیشرفت ہے کیونکہ اگر اسرائیل کے مقبوضہ عرب علاقوں کو خالی کرنے کی صورت میں سعودی عرب اسرائیل کے وجود کو تسلیم کر لیتا ہے تو دنیا کے باقی مسلم ممالک سے اسرائیل کو تسلیم کرانے میں کوئی رکاوٹ نہیں رہے گی۔ اور اسرائیل ایک یہودی ریاست کی حیثیت سے عالم اسلام اور عالم عرب کے درمیان ایک قانونی اور جائز ریاست کا درجہ اختیار کر جائے گا۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

شہزادہ عبد اللہ کی اس تجویز پر نہ صرف امریکی صدر بش اور دیگر امریکی لیڈروں نے ان سے رابطہ کر کے گفتگو کی ہے بلکہ خود اسرائیل کے صدر موشے کٹساف نے اسے مثبت تجویز قرار دیتے ہوئے شہزادہ عبد اللہ کو پیغام بھجوایا ہے کہ وہ اس تجویز پر بات چیت اور اس کی ضروری باتوں کی وضاحت کے لیے بیت المقدس آئیں، یا اسرائیلی صدر کو سعودی عرب آنے کی دعوت دیں اور وہ دونوں صورتوں میں اس تجویز پر گفتگو کے لیے تیار ہیں۔ جبکہ پاکستان کی وزارت خارجہ کے ترجمان عزیز احمد خان نے میجر جنرل راشد قریشی کے ہمراہ مشترکہ پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ سعودی ولی عہد کی اس تجویز کا ہر فورم پر جائزہ لیا جا رہا ہے اور پاکستان بھی اس پر غور کر رہا ہے۔ جب تک اس کا تفصیلی جائزہ نہیں لے لیا جاتا اس پر تبصرہ ممکن نہیں ہے، تاہم انہوں نے عرب علاقوں پر اسرائیلی فوج کے قبضے اور فلسطینیوں پر اسرائیلی مظالم کی مذمت کرتے ہوئے اسرائیل سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ مقبوضہ عرب علاقوں کو خالی کرے اور فلسطینیوں پر مظالم بند کرے۔

فلسطین پر سب سے پہلے حضرت عمرو بن العاصؓ نے ۱۳ھ میں فوج کشی کی اور غزہ پر قبضہ کرنے کے بعد قیساریہ کا محاصرہ کر لیا، مگر یونانیوں کے ایک بڑے لشکر کی آمد کی وجہ سے انہیں وقتی طور پر پیچھے ہٹنا پڑا۔ بعد میں مزید مجاہدین کو جمع کر کے انہوں نے اجنادین کے مقام پر یونانیوں کو شکست دی اور سبطیہ، نابلس، لد، عمواس اور بیت جبرین سمیت بہت سے فلسطینی شہر فتح کر لیے، جبکہ ۱۷ھ میں بیت المقدس فتح ہوا اور اس کے بعد قیساریہ کا محاصرہ کیا گیا۔ اس دوران حضرت عمرو بن العاصؓ کو بلا لیا گیا اور اس مہم کی قیادت حضرت

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

یزید بن ابی سفیانؓ کے سپرد کر دی گئی۔ ان کی وفات کے بعد اس لشکر کے امیر ان کے بھائی حضرت امیر معاویہؓ بنے، ان کی قیادت میں قیساریہ اور عسقلان فتح ہوا اور فلسطین مکمل طور پر اسلامی قلمرو میں شامل ہو گیا۔

پانچویں صدی ہجری کے آخر میں متحدہ صلیبی فوجوں نے یلغار کر کے بیت المقدس پر پھر قبضہ کر لیا جسے سلطان صلاح الدین ایوبیؒ نے ۸۰ برس کے بعد واگزار کرا کے اس پر اسلامی پرچم لہرایا۔ اس کے بعد سے فلسطین ایک مسلم ریاست کے طور پر اسلامی امہ کا حصہ چلا آ رہا ہے۔ ترکی کے سلطان سلیم اول نے ۱۵۱۷ء میں اس پر قبضہ کر کے سلطنت عثمانیہ میں شامل کیا اور چار سو سال تک فلسطین خلافت عثمانیہ کا ایک صوبہ رہا۔ اس دوران یہودیوں کی مسلسل کوشش رہی کہ وہ بیت المقدس میں داخل ہوں اور وہاں آباد ہو کر اسرائیلی ریاست کے قیام کی راہ ہموار کریں مگر خلافت عثمانیہ نے اس کا راستہ نہیں دیا:

- سلطان عبد الحمید ثانی کے دور میں یہودیوں کی عالمی تنظیم نے باقاعدہ پیشکش کی کہ اگر یہودیوں کو فلسطین میں آباد ہونے کی اجازت دے دی جائے تو وہ خلافت عثمانیہ کے سارے قرضے ادا کرنے کے لیے تیار ہیں۔ مگر سلطان عبد الحمید نے یہ پیشکش مسترد کر دی اور یہودیوں کو فلسطین میں آباد ہونے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ جس کے نتیجے میں نہ صرف سلطان عبد الحمید کو خلافت سے محروم ہونا پڑا بلکہ کچھ عرصہ بعد خلافت عثمانیہ کا ہی تیاپانچہ کر دیا گیا۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

- پہلی جنگ عظیم میں یہودیوں نے جرمنی کے خلاف برطانیہ اور اس کے اتحادیوں کا ساتھ دیا جس کی شرائط میں یہ شامل تھا کہ فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن تسلیم کیا جائے اور انہیں وہاں آباد ہونے کے مواقع فراہم کیے جائیں۔ چنانچہ جنگ عظیم میں جرمنی اور اس کی حلیف سلطنت عثمانیہ کی شکست کے بعد برطانیہ نے فلسطین پر قبضہ کر لیا اور اس پر اپنے اقتدار کا اعلان کر دیا۔

۱۹۱۷ء کو ''اعلان بالفور'' کے ذریعے برطانیہ نے فلسطین کو یہودیوں کا وطن تسلیم کرنے کا اعلان کیا اور فلسطین کا قبضہ حاصل کرنے کے بعد ایک برطانوی یہودی کو ہائی کمشنر مقرر کیا جس نے فلسطین میں یہودیوں کی آبادکاری کی راہ ہموار کی۔

- امریکہ کی یہودی تنظیموں نے اس مقصد کے لیے کروڑوں ڈالر مہیا کیے جس کے ذریعے یہودی دنیا کے مختلف حصوں سے آکر فلسطینیوں سے زمینیں خریدنے لگے۔

- اس دوران عالم اسلام کے سرکردہ علماء کرام نے اپنے فتاوٰی کے ذریعہ فلسطینیوں کو اپنی زمینیں یہودیوں کے ہاتھ بیچنے سے روکنے کی کوشش کی، مگر فلسطینیوں نے اس کی پروا کیے بغیر یہودیوں پر اپنی زمینیں بیچنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ جس کے نتیجے میں چند سالوں میں لاکھوں یہودی فلسطین میں آ گئے اور انہوں نے اپنی باقاعدہ مسلح تنظیمیں قائم کر لیں۔ ان کے مقابلے میں فلسطینی بھی منظم ہوئے جس سے باہمی فسادات اور قتل و غارت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

- ۱۹۴۸ء میں برطانیہ نے اقوام متحدہ کے ذریعے فلسطین کو دو حصوں میں تقسیم کر کے اقتدار چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا۔ ایک حصہ یہودیوں کو دے کر ان کی خود مختار سلطنت کو تسلیم کر لیا گیا۔ جبکہ دوسرا حصہ عرب ریاست قرار دیا گیا۔ اس موقع پر اردن نے بیت المقدس اور دریائے اردن کے مغربی کنارے پر قبضہ کر لیا جس سے بیت المقدس اردن کی تحویل میں چلا گیا، اور ۱۹۶۷ء تک بیت المقدس پر اردن کا اقتدار قائم رہا۔
- ۱۹۶۷ء میں اسرائیل نے مصر، شام اور اردن کے خلاف جنگ لڑتے ہوئے ان تینوں ملکوں کے بعض علاقوں پر قبضہ کر لیا جس سے مسلمانوں کا قبلہ اول ایک بار پھر غیر مسلموں کی تحویل میں چلا گیا۔
- ۱۹۷۳ء میں ایک اور عرب اسرائیل جنگ میں مصر نے کچھ مقبوضہ علاقے اسرائیل سے واپس لے لیے لیکن بیت المقدس سمیت بہت سے دیگر مقبوضہ علاقے اسرائیل ہی کے پاس چلے آرہے ہیں۔

اس وقت اسرائیل اور فلسطین کے حوالہ سے تین موقف عالمی رائے عامہ کے سامنے ہیں۔

1. ایک موقف اسرائیل کا ہے جسے امریکہ کی مکمل اور عملی پشت پناہی حاصل ہے کہ اس نے اب تک جن علاقوں پر قبضہ کیا ہے وہ اس کا حصہ ہیں، اور وہ بیت المقدس سمیت کوئی علاقہ خالی کرنے کو تیار نہیں۔ حتٰی کہ بیت المقدس کو

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اسرائیل نے دارالحکومت قرار دے رکھا ہے، بلکہ عظیم اسرائیل کے مستقبل کے حوالے سے جو نقشے شائع ہو رہے ہیں اور ان میں مصر، عراق، شام اور سعودی عرب کے مدینہ منورہ اور خیبر سمیت بہت سے علاقوں کو اسرائیل کا حصہ دکھایا گیا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ان علاقوں پر قبضہ کر کے وہاں تک اسرائیلی ریاست کو توسیع دینا عالمی صہیونی تحریک کے عزائم میں شامل ہے۔

2. دوسرا موقف اقوام متحدہ کی قراردادوں کی صورت میں ہے جن میں ۱۹۴۸ء کے دوران فلسطین کے دو حصوں میں تقسیم ہونے کی حیثیت کو تسلیم کیا گیا ہے، اور اس کے بعد اسرائیل نے جن علاقوں پر قبضہ کیا ہے، اسرائیل سے ان علاقوں کو خالی کرنے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ گویا ان قراردادوں کے ذریعے فلسطین کے ایک حصہ میں قائم اسرائیلی ریاست کو جائز تسلیم کرتے ہوئے اسرائیل سے تقاضہ کیا گیا ہے کہ وہ فلسطین کی ریاست کو تسلیم کرے اور ۱۹۶۷ء کی جنگ میں جن علاقوں پر اس نے قبضہ کیا تھا وہ انہیں خالی کر دے۔ ترکی، اردن اور مصر سمیت بہت سے مسلم ممالک کا موقف یہی ہے اور اسی بنیاد پر انہوں نے اسرائیل کو تسلیم کر رکھا ہے۔

3. تیسرا موقف سعودی عرب اور پاکستان سمیت بہت سے دیگر مسلم ممالک کا ہے کہ سرے سے اسرائیل کا قیام ہی ناجائز ہے، کیونکہ فلسطینیوں کو ان کے گھروں اور علاقوں سے بے دخل کر کے ان پر انگریزوں نے یہودیوں کا غاصبانہ قبضہ کرایا تھا اس لیے اسرائیل کو ایک قانونی اور جائز ملک کے طور پر تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اور عرب اسرائیل تنازعہ کا فیصلہ ۱۹۴۸ء کی پوزیشن پر نہیں بلکہ ۱۹۱۷ء کی پوزیشن پر کیا جانا چاہیے جب فلسطین ایک عرب اور مسلم ریاست کے طور پر متحد تھا۔ اس موقف کو سعودی سلطنت کے بانی ملک عبد العزیز آل سعود نے ۱۹۴۸ء میں امریکی صدر ٹرومین کے ایک دھمکی آمیز خط کے جواب میں دوٹوک طور پر واضح کیا تھا۔ صدر ٹرومین نے اپنے خط میں شاہ عبد العزیز والی سعودی عرب سے کہا تھا کہ وہ عربوں سے اسرائیل کو تسلیم کرانے اور فلسطین کی تقسیم کے بارے میں اقوام متحدہ کی قرارداد کو قبول کرانے کے لیے اپنا اثر ورسوخ استعمال کریں، ورنہ سعودی عرب کے ساتھ امریکہ کے تعلقات متاثر ہو سکتے ہیں، اور اقوام متحدہ کی قراردادوں کو تسلیم نہ کرنے والوں پر مختلف ممالک متحد ہو کر فوج کشی بھی کر سکتے ہیں۔ اس کے جواب میں سعودی عرب کے فرمانروا اور شہزادہ عبد اللہ کے والد محترم ملک عبد العزیز آل سعود نے ٹرومین کو لکھا تھا کہ:

''فلسطین کی جنگ کوئی پرانی جنگ نہیں جیسا کہ آپ کا خیال ہے۔ بلکہ یہ اس کے اصل حقدار عرب قوم اور ان صہیونی جنگجوؤں کے درمیان جاری لڑائی ہے جو فلسطینیوں کی چاہت کے علی الرغم عالمی سلامتی کے قیام کا دعویٰ کرنے والے چند ایک ملکوں کی مدد سے اپنا قبضہ جمانے کی کوشش میں ہیں۔ نیز فلسطین کو تقسیم کرنے کی منظور کردہ قرارداد، جس کو مختلف ملکوں سے منظور کروانے میں آپ کا رول نمایاں رہا ہے، محض ظلم و ناانصافی پر مبنی ایسی قرارداد ہے جس کو ابتدا ہی سے تمام

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

عرب ممالک نے، نیز ان ملکوں نے بھی رد کر دیا ہے جو حق کا ساتھ دے رہے ہیں۔ لہٰذا حالیہ لڑائی کے ذمہ دار عرب نہیں جس پر آپ ہمیں محتاط ہونے کا مشورہ دے رہے ہیں۔"

امریکی صدر ٹرومین کے نام سعودی فرمانروا ملک عبد العزیز آل سعود کا یہ خط دس ربیع الثانی ۱۳۶۷ھ (فروری ۱۹۴۸ء) کا تحریر کردہ ہے۔ دونوں خطوط کا اردو ترجمہ مالیر کوٹلہ (بھارت) کے جریدہ ماہنامہ دارالسلام نے نومبر ۲۰۰۱ء کی اشاعت میں شائع کیا تھا اور ہم نے بھی اسے ماہنامہ الشریعہ گوجرانوالہ کے جنوری ۲۰۰۲ء کے شمارہ میں شائع کر دیا ہے۔

اس پس منظر میں سعودی ولی عہد شہزادہ عبد اللہ کی مذکورہ پیشکش کا جائزہ لیا جائے تو اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ سعودی عرب نے بانی سعودی حکومت ملک عبد العزیز آل سعود کے اس اصولی موقف سے پیچھے ہٹتے ہوئے مصر اور اردن کی طرح فلسطین کی تقسیم کے بارے میں اقوام متحدہ کی اس قرارداد کو قبول کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے جسے بانی سعودی عرب نے "ظلم و ناانصافی پر مبنی قرارداد" قرار دیا تھا، اور جسے قبول نہ کرتے ہوئے سعودی عرب سمیت عالم اسلام کے اکثر ممالک ابھی تک اسرائیل کو ایک ناجائز اور قانونی ریاست کے طور پر تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

اسرائیل اس پیشکش کو قبول کرتا ہے یا نہیں، اور اس تجویز پر مذاکرات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے یا نہیں، اس کا اندازہ چند روز میں ہو جائے گا۔ لیکن فلسطین اور یہودیوں کے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

حوالے سے عالم اسلام کے اصولی اور جائز موقف کی اب تک جرات مندانہ قیادت کرنے والے سعودی عرب کی طرف سے یہ پیشکش بجائے خود عالمی سیاست میں ایک بڑی اور انقلابی تبدیلی کی نشاندہی کر رہی ہے۔

آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا

خلافت عثمانیہ کے خاتمہ میں یہودی کردار:

مجلہ :

روزنامہ اسلام، لاہور

تاریخ اشاعت :

۱۷ مارچ ۲۰۰۳ء

روزنامہ نوائے وقت لاہور نے ۵ مارچ ۲۰۰۳ء کو ایک اسرائیلی اخبار کے حوالہ سے خبر دی ہے کہ اسرائیل کے وزیر دفاع جنرل موفاذ نے کہا ہے کہ چند روز تک عراق پر ہمارا قبضہ ہو گا اور ہمارے راستے میں جو بھی رکاوٹ بنے گا اس کا حشر عراق جیسا ہی ہو گا۔ جنرل موفاذ نے خلافت عثمانیہ کا حوالہ بھی دیا ہے کہ عثمانی خلیفہ سلطان عبد الحمید نے ہمیں فلسطین میں جگہ دینے سے انکار کیا تھا جس کی وجہ سے ہم نے نہ صرف ان کی حکومت ختم کر دی بلکہ عثمانی خلافت کا بستر ہی گول کر دیا۔ اب جو اسرائیل کی راہ میں مزاحم ہو گا اسے اسی انجام سے دوچار ہونا پڑے گا۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اسرائیلی وزیر دفاع کے اس بیان سے یہ حقیقت ایک بار پھر واضح ہوگئی ہے کہ عراق پر امریکی حملے کا منصوبہ در اصل صیہونی عزائم کی تکمیل کے لیے ہے اور اس عالمی پروگرام کا حصہ ہے جو عالم اسلام کے وسائل پر قبضہ اور اسرائیلی سرحدوں کو وسیع اور مستحکم کرنے کے لیے گزشتہ ایک صدی سے تسلسل کے ساتھ جاری ہے اور اس میں امریکہ، برطانیہ اور ان کے اتحادی مسلسل سرگرم عمل ہیں۔

آج سے ایک صدی قبل سلطان عبد الحمید خلافت عثمانیہ کے تاجدار تھے جن کا تذکرہ جنرل موفاذ نے اپنے مذکورہ بیان میں کیا ہے۔ خلافت عثمانیہ کا دار السلطنت استنبول (قسطنطنیہ) تھا اور فلسطین، اردن، عراق، شام، مصر اور حجاز سمیت اکثر عرب علاقے ایک عرصہ سے خلافت عثمانیہ کے زیر نگین تھے۔ فلسطین خلافت عثمانیہ کا صوبہ تھا اور بیت المقدس کا شہر بھی عثمانی سلطنت کے اہم شہروں شمار ہوتا تھا۔ یہودی عالمی سطح پر فلسطین میں آباد ہونے اور اسرائیلی ریاست کے قیام کے ساتھ ساتھ بیت المقدس پر قبضہ کر کے مسجد اقصیٰ کی جگہ ہیکل سلیمانی تعمیر کرنے کا پروگرام بنا چکے تھے اور اس کے لیے مختلف حوالوں سے راہ ہموار کرنے کی کوششوں میں لگے ہوئے تھے۔ سلطان عبد الحمید مرحوم نے اپنی یادداشتوں میں لکھا ہے کہ یہودیوں کی عالمی تنظیم کا وفد ان کے پاس آیا اور ان سے درخواست کی کہ انہیں فلسطین میں آباد ہونے کی اجازت دی جائے۔ چونکہ عثمانی سلطنت کے قانون کے مطابق یہودیوں کو فلسطین میں آنے کی اور بیت المقدس کی زیارت کی اجازت تو تھی مگر وہاں زمین خریدنے اور آباد ہونے کی اجازت نہیں تھی۔ چنانچہ بیسویں صدی کے آغاز تک پورے فلسطین میں یہودیوں کی کوئی بستی نہیں تھی، یہودی دنیا کے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

مختلف ممالک میں بکھرے ہوئے تھے اور کسی ایک جگہ بھی ان کی ریاست یا مستقل شہر نہیں تھا۔ سلطان عبدالحمید مرحوم نے یہ درخواست منظور کرنے سے انکار کر دیا کیونکہ اسرائیل، بیت المقدس اور فلسطین کے بارے میں یہودیوں کا عالمی منصوبہ ان کے علم میں آچکا تھا اس لیے ان کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ اس صورتحال میں یہودیوں کو فلسطین میں آباد ہونے کی اجازت دیتے۔

سلطان مرحوم کا کہنا ہے کہ دوسری بار یہودی لیڈروں کا وفد ان سے ملا تو یہ پیشکش کی کہ ہم سلطنت عثمانیہ کے لیے ایک بڑی یونیورسٹی بنانے کے لیے تیار ہیں جس میں دنیا بھر سے یہودی سائنس دانوں کو اکٹھا کیا جائے گا اور سائنس اور ٹیکنالوجی میں ترقی کے لیے یہودی سائنسدان خلافت عثمانیہ کا ہاتھ بٹائیں گے، اس کے لیے انہیں جگہ فراہم کی جائے اور مناسب سہولتیں مہیا کی جائیں۔ سلطان عبدالحمید مرحوم نے وفد کو جواب دیا کہ وہ یونیورسٹی کے لیے جگہ فراہم کرنے اور ہر ممکن سہولتیں دینے کو تیار ہیں بشرطیکہ یہ یونیورسٹی فلسطین کی بجائے کسی اور علاقہ میں قائم کی جائے۔ یونیورسٹی کے نام پر وہ یہودیوں کو فلسطین میں آباد ہونے کی اجازت نہیں دیں گے لیکن وفد نے یہ بات قبول نہ کی۔

سلطان عبدالحمید مرحوم نے لکھا ہے کہ تیسری بار پھر یہودی لیڈروں کا وفد ان سے ملا اور یہ پیشکش کی کہ وہ جتنی رقم چاہیں انہیں دے دی جائے گی مگر وہ صرف یہودیوں کی ایک محدود تعداد کو فلسطین میں آباد ہونے کی اجازت دے دیں۔ سلطان مرحوم نے اس پر سخت غیظ و غضب کا اظہار کیا اور وفد کو ملاقات کے کمرے سے فوراً نکل جانے کی ہدایت کی نیز اپنے عملہ سے کہا کہ آئندہ اس وفد کو دوبارہ ان سے ملاقات کا وقت نہ دیا جائے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اس کے بعد ترکی میں خلافت عثمانیہ کے فرمانروا سلطان عبد الحمید مرحوم کے خلاف سیاسی تحریک کی آبیاری کی گئی اور مختلف الزامات کے تحت عوام کو ان کے خلاف بھڑکا کر ان کی حکومت کو ختم کرا دیا گیا۔ چنانچہ حکومت کے خاتمہ کے بعد انہوں نے بقیہ زندگی نظر بندی کی حالت میں بسر کی اور اسی دوران مذکورہ یادداشتیں تحریر کیں۔ انہوں نے لکھا ہے کہ انہیں خلافت سے برطرفی کا پروانہ دینے کے لیے جو وفد آیا اس میں ترکی پارلیمنٹ کا یہودی ممبر قرہ صو بھی شامل تھا جو اس سے قبل مذکورہ یہودی وفد میں بھی شریک تھا۔ اور یہ اس بات کی علامت تھی کہ سلطان مرحوم کے خلاف سیاسی تحریک اور ان کی برطرنی کی یہ ساری کارروائی یہودی سازشوں کا شاخسانہ تھی جس کی تصدیق اب تقریباً ایک صدی گزر جانے کے بعد اسرائیلی وزیر دفاع جنرل موفاذ نے بھی مذکورہ بیان میں کر دی۔

سلطان عبد الحمید مرحوم ایک باغیرت اور باخبر حکمران تھے جنہوں نے اپنی ہمت کی حد تک خلافت کا دفاع کیا اور یہودی سازشوں کا راستہ روکنے کی ہر ممکن کوشش کرتے رہے لیکن ان کے بعد بننے والے عثمانی خلفاء کٹھ پتلی حکمران ثابت ہوئے جن کی آڑ میں مغربی ممالک اور یہودی اداروں نے خلافت عثمانیہ کے خاتمے کے ایجنڈے کی تکمیل کی اور ۱۹۲۴ء میں خلافت کا خاتمہ ہو گیا۔ ترکوں نے عرب دنیا سے لاتعلقی اختیار کر کے ترک نیشنلزم کی بنیاد پر سیکولر حکومت قائم کرلی، جبکہ مکہ مکرمہ کے گورنر حسین شریف مکہ نے، جو اردن کے موجودہ حکمران شاہ عبد اللہ کے پردادا تھے، خلافت عثمانیہ کے خلاف مسلح بغاوت کر کے عرب خطہ کی آزادی کا اعلان کر دیا۔ انہیں یہ چکمہ دیا گیا تھا کہ خلافت عثمانیہ کے خاتمہ کے بعد ان کی خلافت عالم اسلام میں قائم ہو جائے گی مگر ان کے ایک بیٹے کو

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

عراق اور دوسرے بیٹے کو اردن کا بادشاہ بنا کر ان کی عرب خلافت کا خواب سبو تاژ کر دیا گیا۔ حجاز مقدس پر آل سعود کے قبضہ کی راہ ہموار کر کے حسین شریف کو نظر بند کر دیا گیا جنہوں نے باقی زندگی اسی حالت میں گزاری۔

اس دوران فلسطین پر برطانیہ نے قبضہ کر کے اپنا گورنر بٹھا دیا جس نے یہودیوں کو اجازت دے دی کہ وہ فلسطین میں آکر جگہ خرید سکتے ہیں اور آباد ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ دنیا کے مختلف ممالک سے منظم پروگرام کے تحت یہودیوں نے فلسطین میں آکر آباد ہونا شروع کیا۔ وہ فلسطین میں جگہ خریدتے تھے اور اس کی دوگنی چوگنی قیمت ادا کرتے تھے۔ فلسطینی عوام نے اس لالچ میں جگہیں فروخت کیں اور علماء کرام کے منع کرنے کے باوجود محض دگنی قیمت کی لالچ میں یہودیوں کو فلسطین میں آباد ہونے کا موقع فراہم کیا۔ اس وقت عالم اسلام کے سرکردہ علماء کرام نے فتویٰ صادر کیا کہ چونکہ یہودی فلسطین میں آباد ہو کر اسرائیلی ریاست قائم کرنا چاہتے ہیں اور بیت المقدس پر قبضہ ان کا اصل پروگرام ہے اس لیے یہودیوں کو فلسطین کی زمین فروخت کرنا شرعاً جائز نہیں ہے۔ یہ فتویٰ دیگر بڑے علماء کرام کی طرح حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے بھی جاری کیا جو ان کی کتاب ''بوادر النوادر'' میں موجود ہے۔ مگر فلسطینیوں نے اس کی کوئی پروانہ کی اور دنیا کے مختلف اطراف سے آنے والے یہودی فلسطین میں بہت سی زمینیں خرید کر اپنی بستیاں بنانے اور آباد ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ حتیٰ کہ ۱۹۴۵ء میں اقوام متحدہ نے یہودیوں کو فلسطین کے ایک حصے کا حقدار تسلیم کر کے ان کی ریاست کے حق کو جائز قرار دے دیا اور

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فلسطین میں اسرائیل اور فلسطین کے نام سے دو الگ الگ ریاستوں کے قیام کی منظوری دے دی جس کے بعد برطانوی گورنر نے اقتدار یہودی حکومت کے حوالہ کر دیا۔

یہ اس بیان کا مختصر سا پس منظر ہے جس میں اسرائیلی وزیر دفاع کے جنرل موفاذ نے خلافت عثمانیہ کے فرمانروا سلطان عبد الحمید مرحوم کی معزولی اور خلافت عثمانیہ کے خاتمہ میں یہودی کردار کا ذکر کیا ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ عالم اسلام کے دشمن کس قدر چوکنا، باخبر اور مستعد ہیں۔ اور اس کے مقابلہ میں ہماری بے حسی، بے خبری اور نا عاقبت اندیشی کی سطح کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ ہمارے حال پر رحم فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

اے خاصۂ خاصانِ رسلؐ وقتِ دعا ہے:

مجلہ :

روزنامہ اسلام، لاہور

تاریخ اشاعت :

۹ دسمبر ۲۰۱۷ء

امریکی صدر ٹرمپ نے بیت المقدس کو اسرائیل کا دارالحکومت تسلیم کر کے امریکی سفارت خانہ وہاں منتقل کرنے کا اعلان کر دیا ہے اور اس مسئلہ پر عالم اسلام کے ساتھ ساتھ اقوامِ متحدہ اور عالمی برادری کے اب تک چلے آنے والے اجتماعی موقف کو بھی مسترد کر دیا ہے جس پر دنیائے اسلام اس کے خلاف سراپا احتجاج ہے۔ اس مذمت و احتجاج میں عالمی رائے عامہ کے سنجیدہ حلقے برابر کے شریک ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ اسلامی سربراہ کانفرنس

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کی تنظیم او آئی سی اور عرب لیگ اس سلسلہ میں مذمت و احتجاج سے آگے بڑھ کر عملی طور پر کیا اقدامات کرتی ہے؟ مذمت و احتجاج کا سلسلہ تو ایک صدی سے جاری ہے، ضرورت عملی اقدامات کی ہے اور اس کے لیے پوری دنیا کی نظریں مسلمان حکمرانوں اور عرب حکومتوں پر ہیں۔ خدا کرے کہ وہ ”ٹرمپائزیشن“ کے سحر سے نکل کر اس طرف کوئی عملی پیش رفت کر سکیں۔

اب سے چودہ برس قبل فلسطین کو اسرائیل میں تبدیل کرنے کے حوالہ سے برطانیہ کے کردار کا ہم نے ماقبل مضمون میں ذکر کیا ہے جبکہ امریکہ اسی برطانوی کردار کے تسلسل کو آگے بڑھانے میں مصروفِ عمل ہے۔ اس مضمون سے بیت المقدس اور فلسطین کے بارے میں اسرائیل، امریکہ اور اس کے حواریوں کے مستقبل کے عزائم کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ گزشتہ ربع صدی کے دوران عالمی استعمار کی گرفت دنیا کے معاملات پر جس طرح مضبوط سے مضبوط تر ہوئی ہے اور وہ جس دیدہ دلیری اور بے فکری سے اپنے ایجنڈے پر عملدرآمد کو تیز سے تیز تر کرتے چلے جا رہے ہیں اور مسلم قیادت جس طرح خوابِ غفلت میں مدہوش دکھائی دے رہی ہے اس پر ہم اپنے جذبات و احساسات عالمِ تصور میں آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور اس درخواست کی صورت میں ہی کر سکتے ہیں کہ

اے خاصہ خاصانِ رسلؐ وقتِ دعا ہے
امت پر تری آکے عجب وقت پڑا ہے

” محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ “

www.KitaboSunnat.com

اسرائیل کے قیام اور بقا کی جدوجہد:

مجلہ :

روزنامہ اسلام، لاہور

تاریخ اشاعت :

۲۹ جولائی ۲۰۱۳ء

روزنامہ "پاکستان" نے ۲۶ جولائی ۲۰۱۳ء کو آن لائن کے حوالہ سے یہ خبر شائع کی ہے کہ امریکہ کی وفاقی اپیل کورٹ نے اسرائیلی مقبوضہ شہر یروشلم کی متنازعہ حیثیت تسلیم کرتے ہوئے سابق امریکی صدر بُش کے دور میں جاری ہونے والے پاسپورٹ قانون کو رد کر دیا ہے۔ وفاقی اپیل کورٹ کے فیصلے کے مطابق یروشلم میں پیدا ہونے والے امریکی شہریوں کے پاسپورٹ میں جائے پیدائش یروشلم نہیں لکھی جا سکے گی۔ العربیہ ٹی وی کے مطابق امریکی اسٹیٹ کولمبیا میں قائم وفاقی عدالت برائے اپیل کے تین ججوں پر مشتمل پینل کی طرف سے جاری کیے جانے والے متفقہ فیصلے میں اس دیرینہ امریکی خارجہ پالیسی کی ان شقوں کو برقرار رکھا گیا ہے جن کے مطابق صرف امریکی صدر کے پاس یہ اختیار موجود ہے کہ وہ اس تاریخی اور مقدس شہر جس کی ملکیت کا دعویٰ فلسطین اور اسرائیل دونوں کرتے ہیں کو متنازعہ یا غیر متنازعہ قرار دے سکتا ہے۔ پینل کی جج کیون ہینڈرسن نے اپنے فیصلے میں لکھا ہے کہ امریکی حکومت میں صرف صدر کے پاس یہ اختیار ہے کہ وہ کسی غیر ملکی ریاست کو تسلیم کرے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

یروشلم اس شہر مقدس کا عبرانی نام ہے جسے ہم ''القدس'' یا ''بیت المقدس'' کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ بعض روایات کے مطابق مکہ مکرمہ میں خانہ کعبہ کی تعمیر کے چالیس سال بعد حضرت یعقوب علیہ السلام نے فلسطین میں بیت المقدس تعمیر کیا تھا اور تب سے وہاں آبادی کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ اس دور میں مکہ مکرمہ بنی اسماعیل کا اور بیت المقدس بنی اسرائیل کا قبلہ قرار پایا تھا اور دونوں میں روحانی برکات اور رونقوں کا سلسلہ تب سے جاری چلا آرہا ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے مصر کا حکمران بننے کے بعد حضرت یعقوب علیہ السلام اور ان کے خاندان نے مصر کو اپنا مسکن بنایا تو اس کے بعد بیت المقدس پر دوسری اقوام کا قبضہ ہو گیا۔ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں بنی اسرائیل کو مصر میں فرعون کی غلامی سے نجات ملی اور وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قیادت میں بحیرۂ قلزم پار کر کے وادی سینا میں پہنچے تو انہیں حکم دیا گیا کہ وہ جہاد کر کے بیت المقدس کو آزاد کرائیں اور اپنے پرانے شہر میں جا کر آباد ہوں۔ مگر بنی اسرائیل نے جہاد کرنے سے انکار کر دیا جس کی سزا انہیں قرآن کریم کے ارشاد کے مطابق یہ ملی کہ چالیس سال تک ان کا داخلہ بیت المقدس میں حرام قرار دے دیا گیا۔ اسی دوران حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کا انتقال ہو گیا اور چالیس سال کا عرصہ گزر جانے کے بعد حضرت یوشع بن نون علیہ السلام کی قیادت میں بنی اسرائیل نے جہاد کے ذریعہ بیت المقدس کو آزاد کرایا۔

پھر ایک عرصہ گزر جانے کے بعد بیت المقدس کا علاقہ دوسری قوموں کے قبضے میں چلا گیا تو حضرت طالوت علیہ السلام کی قیادت میں بنی اسرائیل نے جہاد کر کے وقت کے جابر

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

حکمران جالوت کو شکست دی اور یہ علاقہ آزاد کرایا۔ ان دونوں جنگوں کا تذکرہ قرآن کریم میں موجود ہے۔

حضرت داؤد علیہ السلام نے حضرت طالوتؒ کے جانشین کی حیثیت سے اس نئی مملکت کی حکومت سنبھالی جسے اسرائیل کا نام دیا گیا اور یہ سلطنت حضرت سلیمان علیہ السلام کے دور میں اپنے عروج تک پہنچی۔ آج کے یہودی حضرت سلیمان علیہ السلام کے دور کی اس وسیع سلطنت کو اپنا ہدف اور حق قرار دیتے ہوئے اس کی سرحدوں تک موجود اسرائیل کو وسیع کرنے کا دعویٰ رکھتے ہیں۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس شہر میں ''ہیکل سلیمانی'' تعمیر کیا جو بنی اسرائیل کا قبلہ بنا اور وہ دور اس مقدس شہر کے عروج اور کمال کا دور تھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت سے پانچ صدیاں قبل بابل کے حکمران بخت نصر نے حملہ کر کے اس مقدس شہر کو تاراج کر دیا، ہیکل سلیمانی کو جلا کر راکھ کر دیا، لاکھوں یہودیوں کو قتل کر دیا، پورے شہر کو ملیامیٹ کر دیا اور باقی ماندہ یہودیوں کو جو لاکھوں کی تعداد میں بتائے جاتے ہیں اپنے ساتھ قیدی بنا کر بابل لے گیا۔

ایک عرصہ ویران رہنے کے بعد بیت المقدس دوبارہ آباد ہوا اور ہیکل سلیمانی کی تعمیر پھر سے کی گئی، اس کے بعد اس شہر کے ایک بزرگ خاندان ''آل عمران'' میں اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اپنی قدرت کاملہ سے بغیر باپ کے پیدا کیا اور ان پر انجیل اتاری۔ یہ دور حضرت زکریا علیہ السلام اور حضرت یحییٰ علیہ السلام کا دور ہے جب

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

بیت المقدس کی تولیت ان بزرگوں کے پاس تھی مگر اس پر رومی حکمرانوں کا اقتدار قائم تھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خلاف سازش کر کے یہودیوں نے انہیں رومی حکومت کے ہاتھوں پھانسی دلوانا چاہی مگر اللہ تعالیٰ نے انہیں زندہ آسمانوں پر اٹھالیا۔ ان کے رفع آسمانی کے کچھ عرصہ بعد جب رومیوں نے عیسائیت قبول کر لی تو طیطس رومی نامی مسیحی حکمران نے بیت المقدس پر حملہ کر کے وہاں سے یہودیوں کو نکال دیا، ہیکل سلیمانی کو جلا کر راکھ کر دیا اور یہودیوں کے وہاں رہائش رکھنے پر پابندی لگا دی۔ طیطس رومی کے اس حملہ اور یروشلم سے یہودیوں کے اخراج کے بعد یہ مقدس شہر ان کے ہاتھ سے نکل کر عیسائیوں کے قبضے میں چلا گیا اور دو ہزار سال سے زائد عرصہ تک انہیں دوبارہ اس شہر میں رہنا نصیب نہیں ہوا۔

امیر المؤمنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں "بیت المقدس" مسلمانوں کی تحویل میں آیا اور حضرت عمرؓ نے خود وہاں تشریف لے جا کر اس کا کنٹرول سنبھالا۔ اس سے قبل جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم معراج کے سفر میں وہاں تشریف لا کر حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی امامت فرما چکے تھے اور ہجرت مدینہ کے بعد مسلمان کم و بیش سترہ ماہ بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھتے رہے تھے جس کی وجہ سے بیت المقدس مسلمانوں کا قبلۂ اول کہلاتا ہے اور ان دو حیثیتوں سے مسلمانوں کی عقیدت و محبت اس شہر سے وابستہ چلی آرہی ہے۔

تاریخی روایات کے مطابق حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس مقام پر جو صخرہ کہلاتا ہے اور وہاں معراج کی رات جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سواری باندھی گئی تھی،

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

وہاں نماز ادا کی اور مسجد بنانے کی ہدایت کی۔ اسی پر وہ تاریخی قبہ ہے جو ''قبۃ الصخرۃ'' کے نام سے معروف ہے، خلیفہ عبد الملک بن مروانؒ کے زمانے میں وہاں مسجد تعمیر کی گئی۔

بیت المقدس پر اس وقت اپنے تاریخی پس منظر کے حوالہ سے تین قوموں کا دعویٰ ہے۔ مسلمانوں کا اس وجہ سے کہ وہ ان کا قبلۂ اول ہے، سفر معراج میں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام امامت ہے اور کم و بیش بارہ سو سال ان کی تحویل اور تولیت میں رہا ہے۔ یہودیوں کا اس حوالہ سے کہ ان کے بقول وہاں ان کا وہ ہیکل سلیمانی ہے جو طیطس رومی نے ویران کر دیا تھا، وہ ان کا قبلہ ہے اور یہودی اسے دوبارہ تعمیر کرنے کا زعم رکھتے ہیں، جبکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جائے ولادت ہونے کے باعث ''بیت اللحم'' عیسائیوں کا قبلہ اور متبرک مقام ہے جو بیت المقدس سے تقریباً پانچ میل کے فاصلے پر ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مرزا بہاء اللہ شیرازی کے پیروکار بہائیوں کا قبلہ بھی فلسطین میں ہے جو عکّہ کہلاتا ہے اور فلسطین کا مشہور شہر ہے۔

چونکہ بیت المقدس کو عیسائیوں سے مسلمانوں نے حاصل کیا تھا اس لیے اس کے قبضہ و کنٹرول کے بارے میں مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان شدید مخاصمت رہی ہے۔ صلیبی جنگوں کے دوران یورپ کی متحدہ فوجوں نے گیارہویں صدی عیسوی کے آخر میں بیت المقدس پر قبضہ کر لیا تھا جو کم و بیش نوے سال رہا اور سلطان صلاح الدین ایوبیؒ نے مسلسل معرکوں کے بعد اسے عیسائیوں کے قبضے سے آزاد کرایا۔ بیت المقدس فلسطین کا دارالحکومت تھا جو درمیان کے مذکورہ نوے برس کے عرصہ کے علاوہ حضرت عمرؓ کے دور

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

سے مسلمانوں کے پاس ہی رہا ہے، حتیٰ کہ پہلی جنگ عظیم کے بعد برطانیہ نے دسمبر ۱۹۱۷ء میں اس پر قبضہ کر کے اس پر اپنا اقتدار قائم کر لیا۔

اس سے قبل فلسطین خلافت عثمانیہ کا صوبہ تھا، پہلی جنگ عظیم میں خلافت عثمانیہ نے جرمنی کا ساتھ دیا تھا اس لیے جرمنی کی شکست کے ساتھ ہی خلافت عثمانیہ بھی شکست و ریخت کا شکار ہو گئی تھی اور اس بندر بانٹ میں فلسطین پر برطانیہ کا قبضہ عالمی سطح پر تسلیم کر لیا گیا۔ ''گاڈ فرے ڈی بولون'' نامی انگریز کمشنر نے ۱۰ دسمبر ۱۹۱۷ء کو فلسطین کا اقتدار سنبھالا اور ۱۵ مئی ۱۹۴۸ء تک فلسطین پر برطانیہ کا قبضہ رہا۔ خلافت عثمانیہ نے یہودیوں کو ویزے پر بیت المقدس آنے اور اپنے مقدس مقامات کی زیارت اور وہاں عبادت کی آزادی دے رکھی تھی مگر انہیں فلسطین میں زمین خریدنے، کاروبار کرنے اور رہائش اختیار کرنے کا حق قانونی طور پر حاصل نہیں تھا۔

اس دوران یہودیوں نے عالمی سطح پر ''صہیونیت'' کے عنوان سے ایک تحریک کا آغاز کیا۔ صہیون بیت المقدس کا ایک پہاڑ ہے جو یہودیوں کے ہاں بہت متبرک سمجھا جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ اس پہاڑی پر حضرت داؤد علیہ السلام کی عبادت گاہ تھی۔ اس پہاڑ کے تقدس کو عنوان بنا کر یہودیوں نے تحریک شروع کی جس میں فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن قرار دے کر اسے واپس لینے کا عزم کیا گیا تھا۔ صہیونی تحریکوں کے لیڈروں نے اس وقت کے عثمانی خلیفہ سلطان عبد الحمید دوم مرحوم سے درخواست کی کہ یہودیوں کو فلسطین میں آباد ہونے کا حق دیا جائے۔ سلطان نے اس سے انکار کر دیا، انہیں بیش بہا مالی مراعات کی پیش کش کی جو انہوں نے قبول نہیں کیں۔ سلطان عبد الحمید دوم نے اپنی یادداشتوں

'' محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ ''

www.KitaboSunnat.com

میں لکھا ہے کہ انہیں معلوم تھا کہ یہودی صرف فلسطین میں آباد ہونے کا حق نہیں مانگ رہے بلکہ اس کی آڑ میں بیت المقدس پر قبضہ کرنے کا پروگرام رکھتے ہیں، اس لیے ان کی ملّی غیرت نے گوارا نہیں کیا کہ وہ یہودیوں کو اس بات کا موقع فراہم کریں۔ اس وجہ سے سلطان عبد الحمید دوم یہودیوں کے غیظ و غضب کا نشانہ بنے اور ان کے خلاف وہ تحریک چلی جس کے نتیجے میں وہ خلافت سے محروم ہو کر نظر بندی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو گئے اور اسی نظر بندی میں ان کا انتقال ہوا۔

اس موقع پر برطانیہ کے وزیر خارجہ بالفور نے اعلان کیا کہ وہ فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن تسلیم کرتے ہیں اور موقع ملنے پر انہیں وہاں آباد ہونے کی سہولت فراہم کرنے کا وعدہ کرتے ہیں۔ اسے اعلان بالفور کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے عوض یہودیوں نے پہلی جنگ عظیم کے دوران برطانیہ کے مالی نقصانات کی تلافی کرنے کا وعدہ کا تھا اور ان مالی مفادات کے باعث برطانیہ اور اس کے ساتھی ممالک نے فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن تسلیم کرنے کا اعلان کیا تھا۔

چنانچہ جب فلسطین برطانیہ کے قبضے میں گیا تو وہ قانون منسوخ کر دیا گیا جس کے تحت یہودیوں کو فلسطین میں زمین خریدنے اور سکونت اختیار کرنے سے روکا گیا تھا۔ اس کے بعد دنیا بھر سے یہودی وہاں آنا شروع ہو گئے اور فلسطین میں زمینیں اور مکانات خرید کر انہوں نے آباد ہونے کا آغاز کر دیا۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اس موقع پر مفتی اعظم فلسطین الحاج سید امین الحسینیؒ نے فتویٰ جاری کیا کہ چونکہ یہودی بیت المقدس میں آباد ہو کر بیت المقدس پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں اس لیے فلسطین کی زمین یہودیوں پر فروخت کرنا شرعاً جائز نہیں۔ برصغیر کے اکابر علماء کرام نے بھی جن میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ اور مفتی اعظم ہند حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلویؒ شامل ہیں اس فتویٰ کی تائید کی۔ مگر اس فتویٰ کے باوجود فلسطین میں یہودیوں پر زمینوں اور مکانات کی فروخت نہیں رکی۔ صرف اتنا ہوا کہ زمینوں کی قیمتیں بڑھ گئیں اور یہودیوں نے جو دنیا کے مختلف ممالک سے وہاں مسلسل آرہے تھے دُگنی چوگنی قیمتوں پر فلسطین کا ایک بڑا حصہ خرید لیا۔

۱۹۱۸ء سے ۱۹۴۸ء تک برطانیہ نے فلسطین میں یہودیوں کی آمد اور آبادی کی سرپرستی کر کے "اعلان بالفور" کے ذریعہ کیا گیا وعدہ پورا کیا اور جب دیکھا کہ فلسطین کا ایک بڑا حصہ یہودی خرید چکے ہیں تو ۱۵ مئی ۱۹۴۸ء کو فلسطین کا علاقہ یہودیوں اور فلسطینیوں کے درمیان تقسیم کرنے کا اعلان کر کے برطانیہ وہاں سے چلا گیا۔ اس کے بعد فلسطینیوں اور یہودیوں کے درمیان جنگوں اور جھڑپوں کا وسیع سلسلہ چل نکلا۔ یہودیوں نے اپنے لیے برطانیہ کی طرف سے مخصوص کردہ علاقے میں اسرائیل کے نام سے نئی سلطنت قائم کرنے کا اعلان کر دیا جسے امریکہ اور روس سمیت عالمی طاقتوں نے تسلیم کر لیا اور اقوام متحدہ نے بھی اسرائیل اور فلسطین کے درمیان حد بندی کر کے اسرائیل کو ایک آزاد ریاست قرار دینے کا اعلان کر دیا۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اس کشمکش میں یہودیوں نے اچھے خاصے علاقے پر قبضہ کیا مگر بیت المقدس کا مشرقی حصہ جس میں بیت المقدس کا مقدس احاطہ ہے، اردن کے پاس رہا اور اس پر اس کا انتظامی حق تسلیم کر لیا گیا۔ ۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ میں اسرائیل نے (مصر، شام اور اردن کے دیگر علاقوں کے ساتھ) یروشلم کے مشرقی حصے اور مسجد اقصیٰ پر بھی قبضہ کر لیا اور اس وقت سے یہ علاقہ اسرائیل کے قبضے میں ہے۔

اس کے بعد سے فلسطین اور بیت المقدس کے بارے میں عالمی سطح پر مسلمانوں کے دو موقف پائے جاتے ہیں۔ ایک موقف پاکستان، سعودی عرب اور بعض دیگر ممالک کا ہے کہ وہ سرے سے فلسطین کی تقسیم کو ہی تسلیم نہیں کرتے اور نہ ہی اسرائیل کو ایک قانونی ریاست کا درجہ دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک فلسطین ایک اکائی ہے اور اس پر صرف فلسطینیوں کا حق ہے۔ دوسرا موقف مصر، شام اور اسرائیل کو تسلیم کر لینے والے بعض ممالک کا ہے کہ وہ اسرائیل کو اقوام متحدہ کی تقسیم اور فیصلے کے مطابق ایک آزاد ریاست تسلیم کرتے ہیں لیکن ان کا مطالبہ ہے کہ اسرائیل اقوام متحدہ کے طے کردہ نقشے کے مطابق ۱۹۶۷ء کی جنگ سے پہلے کی سرحدوں کی طرف واپس جائے، بیت المقدس کا قبضہ چھوڑ دے اور فلسطینیوں کی ان کے علاقے میں آزاد ریاست کو تسلیم کرے۔

اسرائیل نے اس دوران مسلسل کوشش کی ہے کہ بیت المقدس پر اس کے قبضے کو جائز تسلیم کیا جائے اور یروشلم کو غیر متنازعہ شہر قرار دے کر اسرائیل میں شامل قرار دیا جائے لیکن عالمی رائے عامہ اس کے اس موقف کو قبول نہیں کر رہی۔ ۱۹۹۵ء میں جب اسرائیل نے یروشلم کو اپنا دارالحکومت قرار دیا تو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے ۵ دسمبر

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

۱۹۹۵ء کو بھاری اکثریت کے ساتھ قرار داد منظور کر کے اسرائیل کے اس اقدام کو غیر قانونی قرار دے دیا اور واضح طور پر کہا کہ یروشلم کی حیثیت ایک متنازعہ شہر کی ہے اور باقاعدہ فیصلہ ہونے تک یہ متنازعہ شہر ہی رہے گا۔

اسی سلسلہ میں سابق امریکی صدر بُش کے دورِ حکومت میں ایک قانون جاری کیا گیا کہ یروشلم میں پیدا ہونے والے امریکی شہری کی جائے پیدائش اس کے پاسپورٹ میں یروشلم لکھی جاسکتی ہے جس کا مطلب یہ بنتا ہے کہ امریکہ کے نزدیک یروشلم متنازعہ شہر نہیں ہے۔ لیکن خود امریکہ کی وفاقی اپیل کورٹ نے اس قانون کو مسترد کر دیا ہے اور یروشلم کی متنازعہ حیثیت برقرار رکھنے کے حق میں فیصلہ دیا ہے۔

اس پس منظر میں امریکہ کی وفاقی اپیل کورٹ کا یہ فیصلہ خوش آئند ہے جس کا خیر مقدم کیا جانا چاہیے، لیکن صرف اتنا کافی نہیں ہے بلکہ فلسطینیوں کو جو دنیا بھر میں لاکھوں کی تعداد میں پناہ گزین ہیں اور مہاجر ہیں، ان کا وطن واپس دلانے اور بیت المقدس کو اسرائیل کے ناجائز تسلط سے آزاد کرانے کے لیے اسلامی تعاون تنظیم (او آئی سی) کو سنجیدگی کے ساتھ کوئی ٹھوس لائحہ عمل اختیار کرنا چاہیے کہ ہمارا ملی فریضہ بہر حال یہی بنتا ہے۔

فلسطینی ریاست کا قیام:

مجلہ :

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ

تاریخ اشاعت :

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

دسمبر ۲۰۰۴ء

روزنامہ اسلام لاہور نے ۷ انومبر ۲۰۰۴ء کی اشاعت میں اے این این کے حوالے سے خبر شائع کی ہے کہ مشرقِ وسطیٰ کے لیے اقوامِ متحدہ کے خصوصی نمائندہ ترج روٹد لارسن نے گزشتہ روز اقوامِ متحدہ کے دفتر میں پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے توقع ظاہر کی ہے کہ ۲۰۰۸ء سے قبل آزاد فلسطینی ریاست کا قیام ممکن ہے۔ انہوں نے کہا کہ مشرقِ وسطیٰ میں امن کے قیام کے لیے سب سے اہم چیز فلسطینی ریاست کا قیام ہے، چاہے یہ ۲۰۰۵ء میں قائم ہو یا ۲۰۰۸ء میں وجود میں آئے۔ لارسن نے مزید کہا کہ مشرقِ وسطیٰ امن روڈ میپ کو خطے میں اسرائیلی اور فلسطینی ریاست کے قیام کے ہدف کو حاصل کرنے کے لیے بلیو پرنٹ کی حیثیت حاصل رہنی چاہیے۔

فلسطینی ریاست کے قیام کا حق اقوامِ متحدہ نے اصولی طور پر اسی وقت تسلیم کر لیا تھا جب برطانوی انتداب کے دور میں دنیا بھر سے یہودیوں کو لا کر فلسطین میں بسانے کے بعد فلسطین کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا، اور ایک حصہ اسرائیل کے قیام کے لیے یہودیوں کے حوالے کر دینے کے بعد دوسرے حصے میں فلسطینیوں کے آزاد قومی وطن کے قیام کا حق تسلیم کر لیا گیا تھا۔ مگر عملاً یہ ہوا کہ اسرائیل تو قیام ہو گیا اور اسے عالمی سرپرستی بھی حاصل ہو گئی، حتیٰ کہ اسے مضبوط سے مضبوط تر کرنے کے لیے امریکہ اور دیگر مغربی ممالک نے اس کی مکمل پشت پناہی کی جو اَب بھی جاری ہے، لیکن فلسطین کی آزاد ریاست کے قیام کی فائل اقوامِ متحدہ، اسرائیل، امریکہ اور عرب حکومتوں کے دارالحکومتوں کے درمیان فٹ بال بنی رہی۔ فلسطینی عوام اور بہت سے عرب ممالک نے فلسطین کی تقسیم کو

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

قبول کرنے اور اسرائیل کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا جسے بہانہ بنا کر اقوامِ متحدہ اور مغربی ممالک نے فلسطینیوں کے آزاد وطن کے حق سے آنکھیں پھیر لیں اور خود اپنے فیصلے اور وعدے پر عملدر آمد کا اہتمام کرنے کی بجائے اسرائیل کو مستحکم کرنے میں لگے رہے۔ مگر یہ بہانہ اس وقت دنیا کے سامنے بے نقاب ہو گیا جب بعض عرب ممالک اور یاسر عرفات مرحوم کی قیادت میں تحریکِ آزادیٔ فلسطین نے فلسطین کی تقسیم اور اسرائیل کو وجود کو تسلیم کرتے ہوئے فلسطین کے باقی ماندہ حصے پر آزاد فلسطین ریاست کے قیام کا حق مانگا تو اس وقت امریکہ اور اقوامِ متحدہ کی منافقت کھل کر سامنے آگئی، اور خود اقوام متحدہ کی طرف دیے گئے اس حق کو بھی انہوں نے مسلسل ٹالنا شروع کر دیا۔

چنانچہ اب فلسطین کی تقسیم کے لیے اقوامِ متحدہ کے نصف صدی قبل کے فیصلے پر عملدر آمد کی بجائے ایک چوتھائی سے بھی کم رقبے پر آزاد فلسطینی ریاست کے قیام کی بات کی جا رہی ہے، اور اس کی راہ میں بھی مسلسل روڑے اٹکائے جا رہے ہیں۔ تحریکِ آزادیٔ فلسطین نے بعض عرب ممالک کے ہمراہ آج سے کم و بیش دس سال قبل جب فلسطین کی تقسیم کے بارے میں اقوامِ متحدہ کے فارمولے کو قبول کرنے کا فیصلہ کیا تھا تو اس کے صحیح یا غلط ہونے سے قطع نظر اقوامِ متحدہ اور مغربی ممالک کی یہ ذمہ داری بنتی تھی کہ وہ کسی تاخیر کے بغیر اس پر عملدر آمد کا اہتمام کرتیں، لیکن مختلف حیلوں بہانوں سے آزاد فلسطینی ریاست کی سرحدوں کو مزید سکیڑا جا رہا ہے، کوشش کی جا رہی ہے کہ فلسطین میں اپنی مرضی کی قیادت کو سامنے لایا جائے اور اسرائیل کی بالادستی کے لیے علاقے میں کوئی چیلنج باقی نہ رہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فلسطینیوں کے ساتھ گزشتہ پون صدی سے جو مسلسل ظلم ہو رہا ہے اور ان کے جائز حقوق جس بے دردی سے پامال کے لیے جا رہے ہیں وہ عالمی ضمیر کے لیے امتحان کی حیثیت رکھتے ہیں، مگر جب خود عربوں اور مسلمانوں کا ضمیر ہی سویا ہوا ہے تو عالمی ضمیر کو جگانے کا کام کون کرے گا؟ اللہ تعالیٰ ہمارے حال پر رحم فرمائیں۔

بیت المقدس اور مسلم حکمرانوں کا طرزِ عمل:

مجلہ :

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ

تاریخ اشاعت :

جنوری ۲۰۱۸ء

اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے امریکی سفارت خانہ کی بیت المقدس میں منتقلی کے اعلان کو بھاری اکثریت کے ساتھ مسترد کر کے اپنے اس موقف کا اعادہ کیا ہے کہ بیت المقدس ابھی تک متنازعہ علاقہ ہے اور اسے اسرائیل کا دارالحکومت تسلیم کرنے کا فیصلہ بین الاقوامی معاملات اور قوانین کے منافی ہے۔

فلسطین آج سے سو سال قبل خلافت عثمانیہ کا ایک صوبہ تھا، جنگ عظیم میں جرمنی کے ساتھ خلافت عثمانیہ بھی شکست سے دوچار ہو گئی تھی جس کے نتیجے میں جرمنی کے ساتھ ساتھ خلافت عثمانیہ کے بہت سے علاقوں کو بھی فاتح اتحادی فوجوں نے قبضہ میں لے لیا تھا اور اس بندر بانٹ میں فلسطین برطانیہ کے حصے میں آیا تھا۔ اس وقت فلسطین میں یہودیوں

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کی آبادی صرف دو ہزار کے لگ بھگ بتائی جاتی ہے لیکن یہودیوں نے عالمی سطح پر فیصلہ کر رکھا تھا کہ وہ دنیا بھر سے فلسطین میں آکر آباد ہوں گے اور اپنی ریاست قائم کر کے بیت المقدس کو اس کا دارالحکومت بنائیں گے۔ اس کے لیے برطانیہ نے ان کے ساتھ وعدہ کیا ہوا تھا کہ وہ فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن تسلیم کرتا ہے اور جب موقع ملا انہیں فلسطین میں آباد ہونے کا موقع فراہم کرے گا۔ یہ وعدہ برطانوی وزیر خارجہ مسٹر بالفور کے ساتھ ایک معاہدہ کی صورت میں ہوا تھا جسے ''اعلان بالفور'' کے عنوان سے یاد کیا جاتا ہے۔ چنانچہ برطانیہ نے فلسطین کا کنٹرول سنبھالنے کے بعد دنیا بھر سے یہودیوں کو فلسطین میں بلا کر بسانے کا سلسلہ شروع کیا جو کم و بیش ربع صدی جاری رہا اور جب یہودیوں کی آبادی اتنی ہو گئی کہ ان کی ریاست بنوائی جا سکے تو برطانوی حکومت نے اقوام متحدہ کے سامنے یہ معاملہ پیش کر کے ۱۹۴۵ء میں اسرائیلی ریاست کے قیام کا فیصلہ کروالیا اور فلسطین کے ایک حصے پر اسرائیل کے نام سے یہودی ریاست دنیا کے نقشے پر نمودار ہو گئی۔

اس موقع پر اقوام متحدہ نے فلسطین کے ایک حصے پر اسرائیل کا حق تسلیم کرتے ہوئے دوسرے حصہ میں فلسطین کی ریاست قائم کرنے کا وعدہ کیا جو آج تک ایک باقاعدہ اور خودمختار ریاست کے طور پر تشکیل نہیں پا سکی، جبکہ بیت المقدس کو متنازعہ قرار دے کر عارضی طور پر اردن کی تحویل میں دے دیا اور کہا گیا کہ اس کا فیصلہ بعد میں کیا جائے گا، اس طرح فلسطین کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ مگر اسرائیل نے ۱۹۶۷ء میں مصر، شام اور اردن کے ساتھ جنگ میں بیت المقدس پر قبضہ کیا اور اس کے ساتھ مصر اور شام کے بعض علاقوں پر بھی قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد سے بیت المقدس کا شہر اسرائیل کے زیر انتظام ہے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

جبکہ وہ بین الاقوامی معاہدات اور اعلانات کی رو سے ایک متنازعہ علاقہ ہے، اسرائیل نے بیت المقدس کو اپنا دارالحکومت قرار دینے کا بھی اس کے بعد اعلان کر دیا جسے بین الاقوامی برادری نے تسلیم نہیں کیا۔

اس سلسلہ میں سب سے زیادہ قابل توجہ امر مسلم حکمرانوں کا طرز عمل ہے کہ ترکی کے صدر حافظ رجب طیب اردگان نے تو متحرک اور جرأتمندانہ کردار ادا کرتے ہوئے عالمی رائے عامہ کے ساتھ ساتھ او آئی سی (اسلامی تعاون تنظیم) کا ہنگامی اجلاس طلب کر کے ملت اسلامیہ کا اجتماعی موقف دنیا کے سامنے از سرِ نو پیش کرنے کا اہتمام کیا ہے، اور ہمارے خیال میں او آئی سی کا یہی فیصلہ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے مذکورہ فیصلے کا محرک بنا ہے۔ لیکن اس مسئلہ پر دنیا بھر کی مسلمان حکومتوں بالخصوص عرب حکمرانوں کو جس طرح فعال ہونا چاہیے تھا وہ نظر نہیں آیا۔ بیت المقدس صرف فلسطینیوں کا نہیں بلکہ مسلمانوں کا قبلۂ اول اور جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزۂ سفر معراج کی ایک اہم منزل ہونے کی وجہ سے پورے عالمِ اسلام کی عقیدتوں اور محبتوں کا بھی مرکز ہے اور اسے اس طرح عالمی طاقتوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دینا ملّی حمیت کے منافی ہے۔

او آئی سی کی قرارداد اس حوالہ سے حوصلہ افزا ہے مگر ہمارے خیال میں ترکی کے صدر محترم کے اس اعلان کو بھی اجتماعی شکل دینے کی ضرورت کہ وہ مشرقی بیت المقدس کو فلسطین کا دارالحکومت تسلیم کرتے ہیں اور ترکی کا سفارت خانہ وہاں منتقل کرنے کے لیے تیار ہیں۔ اسرائیلی عزائم اور اقدامات کے خلاف قراردادیں تو پون صدی سے منظور ہوتی آرہی ہیں، اصل ضرورت عملی اقدامات، عالم اسلام کے متفقہ موقف کو پوری قوت کے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ساتھ عالمی سطح پر پیش کرنے، اس کے لیے عالمی رائے عامہ ہموار کرنے اور بین الاقوامی اداروں کو اس کی طرف توجہ دلانے کی ہے۔ جس کے لیے عرب لیگ اور او آئی سی کو کوئی متفقہ لائحہ عمل طے کرنا چاہیے، ورنہ محض قراردادوں اور اعلانات کے ذریعے اسرائیل کے توسیع پسندانہ عزائم کو روکنا اور اس کے امریکہ جیسے سرپرستوں کو صدر ٹرمپ کے مذکورہ اعلان جیسے اشتعال انگیز اقدامات سے باز رکھنا ممکن نہیں ہو گا۔

مسئلہ فلسطین اور برطانوی وزیر خارجہ بالفور کا موقف:

مجلہ :

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ

تاریخ اشاعت :

مئی ۲۰۰۷ء

اصل عنوان :

فلسطینیوں کے قتل کا عدالتی حکم نامہ:

روزنامہ پاکستان لاہور ۲۳ اپریل ۲۰۰۷ء کی ایک خبر کے مطابق اسرائیلی سپریم کورٹ نے فلسطینیوں کے قتل کو جائز قرار دے دیا ہے۔ خبر میں بتایا گیا ہے کہ ۹ نومبر ۲۰۰۵ء کو اسرائیلی فوج نے ایک فلسطینی کو راہ چلتے شہید کر دیا تھا جس پر انسانی حقوق کی تنظیموں اور عرب ممالک نے صدائے احتجاج بلند کی، اسرائیلی سپریم کورٹ نے اس احتجاج

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کے خلاف فیصلہ دیتے ہوئے اعلان کیا ہے کہ فلسطینیوں کو قتل کرنا جائز ہے، فیصلہ میں کہا گیا ہے کہ سرحد پر تعینات فوجی کسی بھی فلسطینی کو دیکھتے ہی گولی مار دے۔

اسرائیلی فوج کے ہاتھوں فلسطینیوں کے قتل عام کا سلسلہ اسرائیل کے قیام کے وقت سے جاری ہے اور اب تک ہزاروں فلسطینی اسرائیلی فوج کی اس بربریت کی بھینٹ چڑھ چکے ہیں، لیکن انتہائی حیرت اور افسوس کی بات یہ ہے کہ اس قتل عام کو ایک ایسے ادارے کی طرف سے باقاعدہ جواز کی سند دی جارہی ہے جس ادارے کو دنیا کے کسی بھی ملک میں انصاف کی برتری اور انسانی جان ومال کے تحفظ کی سب سے بڑی علامت تصور کیا جاتا ہے۔ اور ستم بالائے ستم یہ ہے کہ اسرائیل کو اس نسل پرستی، ظلم و جبر اور دہشت گردی کے باوجود انسانی حقوق کے علمبردار مغربی ملکوں کی مسلسل حمایت حاصل ہے اور اس کے ہر جائز و ناجائز اقدام کی مغربی ممالک کی طرف سے پشت پناہی بے دریغ جاری ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ جس کام کی بنیاد ہی ظلم و جبر، ناانصافی اور حق تلفی پر رکھی گئی ہو اس سے کسی مرحلہ میں خیر کی توقع نہیں کی جاسکتی، ابھی چند روز قبل پروفیسر سید حبیب الحق ندوی کی کتاب ''فلسطین اور بین الاقوامی سیاست'' میں ہم نے یہ پڑھا کہ جب برطانوی وزیر خارجہ بالفور نے ۱۹۱۷ء میں ایک اعلامیہ کے ذریعے فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن تسلیم کرنے کا اعلان کیا تو اس وقت معروضی صورتحال یہ تھی کہ فلسطین سلطنت عثمانیہ کا ایک صوبہ تھا، اس کی آبادی ۹۰ فی صد سے زیادہ عربوں اور مسلمانوں پر مشتمل تھی، ملک کی ۹۷ فی صد زمین عربوں کی ملکیت تھی اور یہودیوں کی آبادی پورے فلسطین میں آٹھ فی

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

صد سے زائد نہ تھی۔ اس صورتحال میں جب یہ سوال اٹھایا گیا کہ ان زمینی حقائق کی روشنی میں فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن کیسے قرار دیا جاسکتا ہے تو برطانوی وزیر خارجہ بالفور نے ۱۱ اگست ۱۹۱۹ء کو ایک یادداشت کے ذریعے دنیا کو بتلایا کہ:

"ہمیں فلسطین کی مقامی آبادی سے مشورہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، چار بڑی طاقتیں صہیونی قوت سے وعدہ کر چکی ہیں۔ رہی صہیونیت، تو یہ غلط ہو یا صحیح، اچھی ہو یا بری، اس کی جڑیں قدیم روایات سے سرایت کر چکی ہیں جو گہری ہیں۔ دورِ حاضر کے تقاضے ہوں یا مستقبل کی امیدیں، ان کے اثرات سات لاکھ عربوں سے، جو فی الحال اس قدیم سرزمین پر آباد ہیں، کہیں زیادہ عمیق اور گہرے ہیں"۔

یہ وہ فکری اور اخلاقی بنیاد ہے جس پر برطانیہ اور اس کے ہمنواؤں نے فلسطین کو یہودیوں کے قومی وطن کے طور پر تسلیم کرنے کا اعلان کیا تھا بلکہ برطانیہ نے ۱۹۱۷ء سے ۱۹۴۷ء تک فلسطین پر اپنے قبضہ کے دوران دنیا بھر سے یہودیوں کو جمع کر کے فلسطین میں انہیں آباد کیا اور اس طرح فلسطین میں یہودی ریاست کے قیام کی راہ ہموار کی۔ یہ فلسطین کی بد نصیبی کی انتہا ہے کہ عرب دنیا اور عالم اسلام ان فلسطینیوں کے حقوق، تشخص اور تحفظ و آزادی کے لیے اسی مغربی دنیا سے توقعات وابستہ کیے ہوئے ہیں جن کے ہاتھوں فلسطین اور فلسطینی اس مقام تک پہنچے ہیں۔ اس پر مظلوم فلسطینیوں کے لیے بارگاہ ایزدی میں رحم کی دعا کے سوا اور کیا کیا جاسکتا ہے؟

اسرائیل کو تسلیم کرنے کے حق میں نئی مہم:

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

مجلہ :

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ

تاریخ اشاعت :

جنوری ۲۰۲۱ء

اسرائیل کو تسلیم کرنے کی بات ایک بار پھر قومی اور بین الاقوامی حلقوں میں زیر بحث ہے اور بعض عرب ممالک کی طرف سے اسرائیل کو تسلیم کیے جانے کے بعد پاکستان سے بھی تقاضہ کیا جارہا ہے کہ وہ اسرائیل کو معروضی حقیقت سمجھ کر تسلیم کرلے اور اس کے ساتھ تعلقات قائم کرنے کی طرف پیشرفت کرے۔ اس بار بعض دینی حلقوں کی طرف سے بھی یہ تقاضہ سامنے آیا ہے اور اس کے لیے جو دلائل دیئے جارہے ہیں ان میں سے ایک دو کا سرسری جائزہ ان سطور میں قارئین کی خدمت میں پیش کیے جارہا ہیں۔

ایک صاحب کا کہنا ہے کہ فلسطین اب سے ایک سو برس پہلے خلافت عثمانیہ کا حصہ تھا اس لیے جب ترکی نے اسرائیل کو تسلیم کر رکھا ہے تو ہمارے تسلیم کرلینے میں کیا حرج ہے؟ یہ بات مغالطہ کے سوا کچھ نہیں، اس لیے کہ بلاشبہ فلسطین خلافت عثمانیہ کا صدیوں تک حصہ رہا ہے اور خلافت عثمانیہ کا دارالحکومت استنبول اور مرکز ترکی تھا، لیکن یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ خلافت عثمانیہ کے پورے دور میں دنیا بھر کے یہودیوں کو فلسطین اور بیت المقدس میں آنے جانے کی سہولت کے باوجود وہاں زمین خریدنے، رہائش اختیار کرنے اور کاروبار کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ عثمانی خلیفہ سلطان عبد الحمید ثانیؒ نے اپنی مطبوعہ یادداشتوں میں لکھا ہے کہ عالمی یہودی قیادت ان سے بار بار تقاضہ کرتی رہی ہے کہ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

یہودیوں کو فلسطین میں جگہ خریدنے اور آباد ہونے کی اجازت دی جائے مگر وہ اس سے انکار کرتے رہے۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ یہ جانتے تھے کہ اس کا مقصد یہ ہے کہ وہ رفتہ رفتہ فلسطین میں آباد ہو کر بیت المقدس پر قبضہ کی راہ ہموار کریں۔ سلطان مرحوم نے لکھا ہے کہ ان کے خلاف سازشوں اور انہیں خلافت سے معزول کر کے جلاوطن کر دینے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ وہ یہودیوں کو اس کی اجازت دینے کے لیے تیار نہیں ہوئے۔

خلافت عثمانیہ کے خاتمہ اور فلسطین پر برطانیہ کے قبضہ کے بعد یہودیوں کے دنیا بھر سے وہاں آکر آباد ہونے کی صورت پیدا ہوئی اور برطانیہ کی زیر سرپرستی انہوں نے پندرہ بیس برسوں میں وہاں اپنی آبادی اس حد تک بڑھائی کہ برطانیہ نے اقوام متحدہ میں ان کا کیس پیش کر کے اس بین الاقوامی فورم پر فلسطین کو تقسیم کر کے یہودی اکثریت کے علاقے کو اسرائیل کے نام نئی ریاست کی صورت دینے کا فیصلہ کرا لیا۔ اس لیے یہ کہنا کہ خلافت عثمانیہ نے اسرائیل کو تسلیم کر لیا ہے تاریخی حقائق سے انکار اور خلافت عثمانیہ کے ساتھ زیادتی و ناانصافی کی بات ہے۔ خلافت عثمانیہ کے خاتمہ کے بعد کا ترکی اس سے بالکل مختلف بلکہ علی الرغم چلا آ رہا ہے، جسے اب دھیرے دھیرے سابقہ پوزیشن پر لے جانے کے لیے ترکی صدر حافظ طیب رجب اردگان کی مساعی لائق تحسین ہیں۔ مگر موجودہ ترکی کے کسی فیصلے کو خلافت عثمانیہ کا فیصلہ قرار دینا زمینی حقائق سے آنکھیں بند کر لینے کے مترادف ہے۔

اسی طرح ایک محترم نے اسرائیل کو تسلیم کرنے کے حق میں قرآن کریم کے اس ارشاد گرامی کا حوالہ دیا ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے فرمایا تھا "اُدخلوا الارض

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

المقدسۃ التی کتب اللّٰہ لکم"۔ مگر یہ بھی کج بحثی اور مغالطہ نوازی ہی کی افسوسناک صورت ہے۔ قرآن کریم نے اس آیت کریمہ میں اس دور کا ذکر کیا ہے جب بنی اسرائیل فرعون سے نجات حاصل کرکے صحرائے سینا میں خیمہ زن ہوئے تھے اور حضرت موسیٰ وھارون علیہما السلام کی قیادت میں فلسطین اور بیت المقدس کی طرف جانے کا عزم رکھتے تھے جہاں ایک ظالم و غاصب قوم کا قبضہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو حکم دیا کہ اس ارض مقدسہ پر غاصب و قابض قوم کے خلاف جہاد کرو اور وہاں جاکر اپنا نظام قائم کرو۔ یہ حکم خداوندی قابض قوم کے وجود کو تسلیم کرتے ہوئے ان کے ساتھ آباد ہو جانے کا نہیں بلکہ اس کے خلاف جہاد کرکے اس سے فلسطین کا قبضہ چھڑوانے کا تھا، جسے موجودہ صورتحال پر منطبق کرکے اس سے اسرائیل کو تسلیم کرنے کا جواز نکالنا انتہائی درجہ کی تحریف ہے جس سے ہر مسلمان کو گریز کرنا چاہیئے۔

بہرحال اب نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ یہودیوں کے ساتھ تعلقات کے شوق میں انہی کی طرح احکام خداوندی اور تاریخی حقائق کو تبدیل کر دینے کی روش اپنائی جارہی ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کی حفاظت فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

ایک بات اور بھی کہی گئی ہے کہ بیت المقدس عربوں کا معاملہ ہے، جب وہ اسرائیل کو موجودہ حالت میں تسلیم کر رہے ہیں ہمیں بھی تسلیم کر لینا چاہیئے۔ ہمارے خیال میں یہ بھی مغربی فکر و دانش کے اس ایجنڈے کا حصہ ہے جس میں وہ اسلام، قرآن کریم اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خوبیوں کا اعتراف کرکے اور مدح و تعریف کرکے یہ کہہ رہے ہیں کہ یہ سب کچھ اچھا ہے مگر عربوں کے لیے تھا۔ بہت سے مغربی دانشور اسلام کو عرب

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

تہذیب کی اعلیٰ ترین شکل اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو عربوں کا نبی کہہ کر اسلام کا دائرہ محدود کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں، جو اسلام کا راستہ روکنے کی منظم حکمت عملی ہے۔ اس تناظر میں بیت المقدس کو عربوں کا معاملہ قرار دے کر اسے عرب و عجم کے حوالہ سے پیش کرنا اسلام کی آفاقیت اور بیت المقدس کے ساتھ دنیا بھر کے مسلمانوں کے تعلق و عقیدت کی نفی ہے جسے کسی صورت قبول نہیں کیا جا سکتا۔ مسجد اقصیٰ اور بیت المقدس دنیا بھر کے مسلمانوں کی عقیدت و محبت کا مرکز اور ان سب کا مشترکہ مسئلہ ہے جسے عربوں کا مسئلہ کہہ کر اس کی اہمیت کو کم نہیں کیا جا سکتا۔

کیا پاکستان کو اسرائیلی ریاست تسلیم کر لینی چاہیے؟

مقام/زیر اہتمام:

سوشل میڈیا

تاریخ بیان:

جنوری ۲۰۱۹ء

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ مجھے اس سوال پر گفتگو کرنی ہے کہ آج کل اسرائیل کے ساتھ تعلقات قائم کرنے کی جو بات ہو رہی ہے اس کے بارے میں پاکستان کا اصولی موقف کیا ہے؟ کیا موقف ہونا چاہیے؟ اور معروضی حالات میں پاکستان کا مفاد کیا ہے؟ لیکن اس سے پہلے مسئلہ کی نوعیت سمجھنے کے لیے اسرائیل کے قیام کے پس منظر پر کچھ گفتگو کرنا ہو گی،

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اس کے بعد موجودہ معروضی صورتحال صحیح طور پر سامنے آئے گی اور پھر میں اپنی رائے کا اظہار کروں گا۔

آج سے ایک صدی پہلے اسرائیل کا کوئی وجود نہیں تھا اور فلسطین کا سارا علاقہ خلافت عثمانیہ کا صوبہ تھا۔ بیت المقدس اور یہ پورا خطہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں فتح ہوا تھا اور حضرت ابو عبیدہ عامر بن الجراحؓ اس علاقہ کے فاتح ہیں۔ امیر المؤمنین حضرت عمرؓ نے خود تشریف لا کر بیت المقدس کا چارج مسیحی قیادت سے لیا تھا۔ طیطس رومی نے حضرت عیسٰی علیہ السلام کے رفع آسمانی کے تقریباً پون صدی بعد بیت المقدس پر قبضہ کر کے یہودیوں کو نکال دیا تھا، ان کا معبد ختم کر کے ان کے داخلہ پر پابندی لگادی تھی، وہ پابندیاں حضرت عمرؓ نے اس حد تک ختم کر دیں کہ یہودیوں کو اپنی عبادت گاہ میں آکر عبادت کرنے کی اجازت حاصل ہوگئی اور یہ اجازت خلافت عثمانیہ کے خاتمہ تک انہیں حاصل رہی ہے۔ اب سے ایک صدی قبل تک فلسطین میں یہودیوں کی آبادی بہت کم تھی، ایک سے دو فیصد بتائی جاتی ہے، یا شاید کچھ زیادہ ہوگی، یہودیوں کو یہ اجازت حاصل رہی ہے کہ وہ آئیں اور دیوار گریہ کے ساتھ جو کہ ان کی عبادت گاہ ہے وہاں عبادت کریں، البتہ فلسطین میں خلافت عثمانیہ کے دور میں، جو کہ چار صدیوں کے عرصہ تک محیط ہے، یہودیوں کو وہاں زمین خریدنے اور کاروبار وغیرہ کرنے کی اجازت نہیں تھی، کیونکہ یہ خدشہ تھا کہ یہودی دو ہزار سال قبل کی پوزیشن پر جا کر فلسطین اور بیت المقدس پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ ان تحفظات کی بنیاد پر کہ فلسطینی جو گزشتہ ڈیڑھ ہزار سال سے وہاں آباد ہیں ان کی آبادی متاثر

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہو گی اور بیت المقدس پر مسلمانوں کا کنٹرول کمزور ہو گا اس لیے یہودیوں کو وہاں آباد ہونے کی اجازت نہیں تھی، البتہ عبادت کے لیے آنے جانے کی سہولت انہیں حاصل رہی۔

اب سے تقریباً سوا صدی پہلے یہودیوں نے عالمی سطح پر ایک تنظیم بنائی اور اس کے تحت یہ پروگرام بنایا کہ ہم نے فلسطین میں دوبارہ آباد ہو کر اور دنیا بھر سے یہودیوں کو وہاں اکٹھا کر کے اپنا سابقہ دور واپس لانا ہے اور اسرائیل کے نام سے ریاست قائم کرنی ہے۔ ''اسرائیل'' حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں ایک بڑی ریاست تھی جسے بحال کرنے کے لیے یہودیوں نے تگ و دو شروع کر دی۔ یہ خلافت عثمانیہ کا دور تھا جس کے تاجدار اس وقت خلیفہ عبد الحمید ثانیؒ تھے، ان سے یہودیوں کے رابطے شروع ہوئے کہ ہمیں فلسطین میں جگہ خرید کر آباد ہونے کی اجازت دی جائے۔ خلیفہ عبد الحمید ثانیؒ نے یہودیوں کے اس مطالبے کو قبول کرنے سے انکار کر دیا، وہ اپنی یادداشتوں میں لکھتے ہیں کہ مجھے معلوم تھا کہ ان کا پروگرام کیا ہے اس لیے میں یہ رسک نہیں لے سکتا تھا۔ خلیفہ سے عالمی یہودی لیڈر ہرتزل کی متعدد ملاقاتیں ہوئیں لیکن خلیفہ کا انکار برقرار رہا۔ اس کے بعد خلافت عثمانیہ خود مسائل کا شکار ہو گئی اور خلیفہ عبد الحمید ثانیؒ کو معزول کر کے نظر بند کر دیا گیا، یہ ایک الگ داستان ہے۔ لیکن یہودیوں کا یہ مشن تھا کہ ہمیں فلسطین میں جگہ خرید کر آباد ہونے کا موقع دیا جائے اور دنیا بھر سے یہودی یہاں جمع ہوں تاکہ ہم اسرائیل کی ریاست بحال کریں، جسے خلافت عثمانیہ نے قبول نہیں کیا۔ یہ جنگ عظیم اول کا زمانہ تھا، یہودیوں نے اس مقصد کے لیے برطانیہ سے رابطہ قائم کیا، اور عیسائی جو کہ یہودیوں کے روایتی حریف تھے کہ عیسائی یہودی دشمنی تو دنیا کی معروف دشمنی ہے، لیکن بہرحال ان کا

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

برطانیہ کے ساتھ معاہدہ ہوا اور برطانوی وزیرخارجہ بالفور نے ۱۹۱۶ء میں ''بالفور ڈیکلیریشن'' کے نام سے یہ اعلان کیا کہ سلطنت عظمیٰ برطانیہ فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن تسلیم کرتی ہے، اور ان کا یہ حق تسلیم کرتی ہے کہ وہ دوبارہ یہاں آکر آباد ہوں اور اپنی ریاست اور وطن بنائیں، اور یہ کہ سلطنت عظمیٰ برطانیہ یہ وعدہ کرتی ہے کہ جب بھی اسے موقع ملاوہ فلسطین میں یہودیوں کو آباد ہونے کا موقع فراہم کرے گی۔

اس دوران جنگ عظیم اول کے نتیجے میں خلافت عثمانیہ ختم ہوگئی، یہ علاقے مختلف ملکوں کے پاس چلے گئے، کچھ فرانس کے پاس، کچھ برطانیہ کے پاس، اس تقسیم میں جو جنگ عظیم اول کے بعد فاتح اتحادی ممالک کے درمیان ہوئی، اس میں فلسطین کا علاقہ برطانیہ نے سنبھال لیا اور اپنا وائسرائے یا گورنر جنرل وہاں مقرر کر کے یہ اعلان کر دیا کہ یہودی دنیا میں جہاں کہیں بھی ہیں وہ یہاں آکر آباد ہو سکتے ہیں۔ یہ ۱۹۱۷ء کے زمانے کی بات ہے کہ یہودیوں نے یہاں آکر آباد ہونا شروع کیا جس کے خلاف فلسطینیوں نے مزاحمت کی اور مختلف مراحل میں تصادم وغیرہ ہوئے، لیکن بہرحال برطانیہ کے انتداب کے دور میں جب انہوں نے فلسطین کو اپنی نو آبادی کے طور پر سنبھال رکھا تھا، اعلان بالفور کے مطابق یہودیوں کو مواقع اور وسائل مہیا کیے اور یہودی یہاں آکر آباد ہونا شروع ہوئے۔ اور پھر جب یہودی اس حد تک یہاں آباد ہوگئے کہ ایک علاقہ ان کے لیے ایک ریاست کے طور پر تسلیم کیا جا سکتا تھا تو ۱۹۴۵ء میں وہ اقوام متحدہ میں فلسطین کی تقسیم اور اسرائیل کے قیام کا کیس لے کر گئے جسے منظور کر لیا گیا، اور پھر برطانیہ اس علاقہ سے چلا گیا اور اسرائیل کے قیام کا اعلان کر دیا گیا۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اقوام متحدہ کے فیصلے کے مطابق فلسطین کو تقسیم کر کے ایک حصے کو اسرائیلی ریاست قرار دیے دیا گیا اور دوسرا حصہ فلسطینیوں کے حصے میں رہا جو کہ ابھی تک نیم ریاست اور نیم نو آبادی اور اس نوعیت کا علاقہ چلا آرہا ہے۔ اس وقت اقوام متحدہ نے فلسطین کی تقسیم قبول کر کے اسرائیلی ریاست کے قیام کی جو منظوری دی، مسلمان ممالک نے مجموعی طور پر اسے قبول نہیں کیا، نہ عرب ممالک نے اور نہ دیگر مسلمان ممالک نے، مسلمانوں نے اسے فلسطینیوں پر ظلم اور بیت المقدس کے خلاف سازش قرار دیا۔ یہ پاکستان بننے سے کچھ عرصہ پہلے کا زمانہ تھا اور بانیٔ پاکستان قائداعظم محمد علی جناحؒ کا یہ واضح بیان بھی ریکارڈ پر موجود ہے کہ اسرائیل ایک ناجائز ریاست ہے اور یہ مسلمانوں کے دل میں خنجر گھونپنے والی بات ہے جسے ہم تسلیم نہیں کریں گے، البتہ بڑی طاقتیں امریکہ، یورپ اور روس وغیرہ اسرائیل کو سپورٹ کرتے رہے۔

اگلا مرحلہ یہ ہوا کہ ۱۹۶۷ء میں ایک اور جنگ ہوئی جس میں اسرائیل کو مغربی طاقتوں کی مکمل پشت پناہی حاصل تھی اور اس نے مصر، اردن اور شام کو شکست دے کر (۱) مصر کے صحرائے سینا (۲) شام کی گولان پہاڑیوں (۳) اور بیت المقدس کے علاقہ پر قبضہ کر لیا جو کہ اس وقت اردن کے پاس تھا۔ یوں اسرائیل نے اپنی سرحدوں میں توسیع کر لی، یہ میری ہوش کا زمانہ تھا اور یہ مناظر میری آنکھوں کے سامنے ہیں، میں بھی اس وقت مظاہروں اور احتجاجی کیمپین میں شریک ہوتا تھا۔ خیر یہ معاملات چلتے رہے، چند سال بعد مصر کی ایک بار پھر اسرائیل سے جنگ ہوئی اور مصر نے صحرائے سینا واپس حاصل کیا، جبکہ گولان پہاڑیاں، یروشلم اور بیت المقدس ابھی تک اسرائیل کے قبضہ میں ہیں۔ اقوام متحدہ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

نے ۱۹۶۷ء کے بعد کی اسرائیل کی حدود کو تسلیم نہیں کیا اور اس کی ابھی تک مسلسل یہ قرار دادیں چلی آرہی ہیں کہ اسرائیل کو ۱۹۶۷ء سے پہلے والی پوزیشن پر واپس چلے جانا چاہیے، عملاً عالمی سطح پر خواہ کچھ بھی ہو رہا ہو لیکن یونائیٹڈ نیشنز کا سرکاری موقف یہ ہے کہ اسرائیل نے ۱۹۶۷ء میں جن علاقوں پر قبضہ کیا تھا وہ انہیں خالی کر دے۔

اس کے بعد صورتحال آگے بڑھی، سرد جنگ میں ایک طرف امریکہ اور اس کے اتحادی ممالک تھے اور دوسری طرف سوویت یونین اور اس کے اتحادی ممالک تھے۔ کچھ عرب ممالک کو امریکہ اور کچھ کو سوویت یونین سپورٹ کر رہا تھا، جبکہ اسرائیل کو تقریباً سبھی سپورٹ کر رہے تھے، اس ساری کشمکش میں ایک مرحلہ ایسا آیا کہ عربوں سے یہ کہا گیا کہ اگر آپ اسرائیل کی ۱۹۶۷ء سے پہلے والی پوزیشن تسلیم کر لیں تو ہم اسرائیل کو واپس جانے پر مجبور کر سکتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں گولان کی پہاڑیاں شام کو واپس ہوں گی اور یروشلم اور بیت المقدس کا علاقہ آزاد ہو گا۔ چنانچہ اس فارمولا کی بنیاد پر کیمپ ڈیوڈ سمجھوتہ ہوا جس میں عربوں سے وعدہ کیا گیا تو اس کے نتیجے میں مصر، شام اور چند دیگر عرب ممالک نے اسرائیل کو تسلیم کر لیا۔ البتہ سعودی عرب، پاکستان، ایران اور دیگر مسلم ممالک اپنے سابقہ موقف پر قائم رہے کہ ہم سرے سے اسرائیل کے وجود کو تسلیم نہیں کرتے۔ چنانچہ اس وقت مسئلہ فلسطین کے حوالے سے تین موقف عالمی فورم پر سامنے ہیں جن کا بیان سطور بالا میں گزر چکا ہے۔

ان تین موقفوں کی بنیاد پر مسئلہ فلسطین اور اسرائیلی ریاست کے حوالے سے کشمکش جاری ہے اور اس پس منظر اور تناظر میں پاکستان سے یہ تقاضہ کیا جا رہا ہے، پاکستان کے اندر

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

سے بھی یہ آوازیں آرہی ہیں اور باہر سے بھی یہ دباؤ ڈالا جارہا ہے، کہ پاکستان اسرائیل کو تسلیم کرکے اس کے ساتھ معمول کے تعلقات قائم کرے۔ اس حوالہ سے ایک بڑی مہم چلائی جارہی ہے جس میں ممکن ہے مزید اضافہ ہو کیونکہ بہت لابنگ اور پراپیگنڈا ہو رہا ہے۔ لیکن میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ یہ بات واضح نہیں ہے کہ ہمارے جو دانشور اس مہم کا حصہ ہیں وہ اسرائیل کو کس تناظر میں تسلیم کرنے کی بات کر رہے ہیں؟ کیا یہ کیمپ ڈیوڈ کے تناظر میں اسرائیل کو تسلیم کرنا چاہتے ہیں جس کے تحت عرب ممالک نے اسرائیل کو ۱۹۶۷ء سے پہلے والی پوزیشن پر واپس جانے کی شرط کے ساتھ تسلیم کیا تھا؟ یا اسرائیل کو اس کے بیت المقدس اور دیگر علاقوں پر قبضہ سمیت تسلیم کرنا چاہتے ہیں؟ لیکن اس صورتحال کو سامنے رکھ کر یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ پاکستان کا مفاد کیا ہے اور پاکستان کی اپنی ضرورت کیا ہے؟

1. سب سے پہلے تو قائد اعظم مرحوم کی بات دہراؤں گا۔ ہم اگر اس وطن کو قائد اعظم کا پاکستان کہتے ہیں، قائد اعظم مرحوم کو پاکستان کا بانی تسلیم کرتے ہیں اور پاکستان کی پالیسیوں کا سرچشمہ قائد اعظم کے اعلانات کو مانتے ہیں، تو پھر جس طرح ہمیں ان کی یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ (۱) کشمیر پاکستان کی شہ رگ ہے (۲) اسی طرح ہمیں قائد اعظم کی یہ بات بھی نہیں بھولنی چاہیے کہ اسرائیل ایک ناجائز ریاست ہے جو کہ مسلمانوں کے دل میں خنجر گھونپنے والی بات ہے جسے ہم تسلیم نہیں کرسکتے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

2. اس کے علاوہ معروضی صورتحال بھی دیکھ لیں، مجھے اس پر تعجب ہوتا ہے کہ مسلم امہ سے تو مطالبہ کیا جاتا ہے کہ وہ اسرائیل کی ریاست کو تسلیم کرے، لیکن اسرائیل پر کسی طرف سے کوئی دباؤ ڈالنے والا نہیں ہے کہ ۱۹۶۷ء سے پہلے والی پوزیشن پر واپس جاؤ۔ میں اگرچہ خود یہ موقف نہیں رکھتا لیکن بالفرض اگر یہ موقف تسلیم کر لیا جائے تب بھی یہ دباؤ تو دوطرفہ ہونا چاہیے۔ اگر مسلم ممالک پر دباؤ ہے کہ وہ اسرائیل کو تسلیم کریں تو اسرائیل سے یہ کیوں نہیں کہا جارہا کہ وہ ۱۹۶۷ء سے پہلے والی پوزیشن پر واپس جائے؟ اسرائیل کو اقوام متحدہ کی قراردادوں کے مطابق ۱۹۶۷ء کی پوزیشن پر واپس لے جائے بغیر مسلم ممالک پر یہ دباؤ ڈالنا کہ وہ اسرائیلی ریاست کو تسلیم کریں، یہ یکطرفہ بات ہے، ناانصافی کی بات ہے، ظلم کی بات ہے، دھاندلی کی بات ہے۔

بلکہ میں اس سے ایک قدم آگے کی بات کروں گا کہ اسرائیل کی ایک حیثیت ۱۹۶۷ء سے پہلے والی ہے جسے اقوام متحدہ تسلیم کرتی ہے۔ اسرائیل کی ایک حیثیت ۱۹۶۷ء کے بعد مختلف علاقوں کے قبضہ کے ساتھ ہے۔ لیکن اس سے اگلا دائرہ گریٹر اسرائیل کا بھی ہے کہ وہ اس سے اگلے مرحلہ پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔ گریٹر اسرائیل کا نقشہ انٹرنیٹ پر موجود ہے جس میں مصر ہے، شام ہے، آدھا سعودی عرب ہے، عراق ہے اور سوڈان وغیرہ ہے۔ یعنی صورتحال یہ ہے کہ اسرائیل نہ صرف یہ کہ ۱۹۶۷ء سے پہلے والی پوزیشن پر واپس جانے کے لیے تیار نہیں بلکہ اس کا اس سے آگے گریٹر

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اسرائیل کا ایجنڈا بھی ہے۔ اسے کوئی کچھ کہنے کے لیے تیار نہیں ہے لیکن مسلم ممالک سے کہا جا رہا ہے کہ اسرائیل جیسا کیسا ہے اسے تسلیم کر لیں۔ یہ غیر منطقی بات ہے، غیر اصولی بات ہے، ناانصافی کی بات ہے، یکطرفہ بات ہے، زیادتی کی بات ہے، اور مطالبہ کرنے والوں کو خود اندازہ نہیں ہے کہ وہ کس بات کا تقاضہ کر رہے ہیں۔ اگر اسرائیل ۱۹۶۷ء سے پہلے والی پوزیشن پر واپس چلا جائے تو اقوام متحدہ کے دائرہ میں کسی حد تک یہ بات سمجھ میں آتی ہے، لیکن وہ تو اقوام متحدہ کی قراردادوں کو تسلیم ہی نہیں کرتا، وہ بین الاقوامی موقف نہیں مان رہا، وہ گریٹر اسرائیل کا ایجنڈا بھی رکھتا ہے جس میں مختلف عرب ممالک پر قبضے کا پروگرام شامل ہے، لیکن ہم سے یہ کہا جا رہا ہے کہ اسرائیل جیسا کیسا ہے اسے قبول کر لیا جائے۔

اس مسئلہ کے ایک اور پہلو پر بھی کچھ عرض کرنا چاہوں گا۔ یہ بات دیکھیے کہ کشمیر پر ہمارا موقف کیا ہے؟ ہم کشمیر پر انڈیا کے قبضے کو ناجائز کہتے ہیں اور کشمیر کو متنازعہ علاقہ مانتے ہیں، جبکہ اقوام متحدہ کی قراردادیں اس سلسلہ میں ہمارے ساتھ ہیں۔ اقوام متحدہ کی قراردادیں موجود ہیں کہ کشمیر ایک متنازعہ علاقہ ہے اور استصواب رائے کشمیری عوام کا حق ہے، یعنی وہ اس بات کا فیصلہ کریں گے کہ کس ملک کے ساتھ ان کا الحاق ہو۔ اگر ہم کشمیر کے معاملہ میں اس بات پر قائم ہیں کہ اقوام متحدہ کی قراردادوں اور عالمی رائے عامہ کے مطابق کشمیری عوام کو اعتماد میں لیے بغیر ہم کشمیر کے متعلق کوئی فیصلہ قبول نہیں کر سکتے، تو پھر فلسطین کے معاملہ میں ہم اقوام متحدہ کی قراردادوں اور عالمی رائے عامہ کو نظر انداز کیوں کرنا چاہتے ہیں؟ اور وہاں فلسطینیوں کو اعتماد میں لیے بغیر اسرائیل کے قبضہ کو غیر

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

مشروط طور پر تسلیم کرنے کی بات کیسے کر رہے ہیں؟ اگر ہم اسرائیل کو موجودہ حیثیت میں تسلیم کرتے ہیں تو اس کا منطقی نتیجہ یہ ہو گا کہ ہمیں کشمیر سے دستبرداری بھی اختیار کرنا ہو گی، یہ نہیں ہو سکتا کہ کشمیر پر ہمارا موقف مختلف ہو اور فلسطین پر ہمارا موقف کچھ اور ہو۔

میں نے تین باتیں عرض کی ہیں۔ پہلی بات یہ کہ اسرائیل کو تسلیم کرنا قائد اعظم مرحوم کے اعلان کے خلاف بات ہو گی۔ دوسری یہ کہ اسرائیل کو کم از کم ۱۹۶۷ء سے پہلے والی پوزیشن پر بھیجے بغیر اسرائیل کو تسلیم کرنا ظلم کی بات ہو گی۔ اور تیسری بات میں نے یہ عرض کی ہے کہ کشمیر اور فلسطین دونوں بڑے مسئلے ہیں، دونوں کی پوزیشن تقریباً ایک جیسی ہے کیونکہ کشمیر کے معاملہ میں انڈیا اقوام متحدہ کی قراردادوں کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہے، جبکہ فلسطین کے معاملہ میں اسرائیل اقوام متحدہ کی قراردادوں کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ ہم اگر ایک مسئلہ پر لچک اختیار کریں گے تو دوسرے مسئلہ پر ہمارے لیے کھڑے رہنے کا کوئی جواز باقی نہیں رہے گا۔ اس لیے میں یہ سمجھتا ہوں کہ پاکستان سے یہ بات کہنے والے، کہ وہ اسرائیل کو موجودہ حیثیت میں تسلیم کر لے، ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہتے ہیں اور یہ بالواسطہ کشمیر پر انڈیا کے قبضے کو تسلیم کروانے کی بات ہو گی۔ اس لیے ہمیں اس سازش کو سمجھنا چاہیے کہ اس سے مسئلہ فلسطین تو متاثر ہو گا ہی، اس کے ساتھ مسئلہ کشمیر بھی متاثر ہو گا، اس لیے ہمیں بڑی سوچ سمجھ اور دیانتداری کے ساتھ زمینی حقائق کا ادراک کرتے ہوئے فلسطینیوں اور کشمیریوں کے جائز حقوق اور امت مسلمہ کے مفاد کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے اور محض لابنگ اور پراپیگنڈا سے متاثر ہو کر اسرائیل کو تسلیم کرنے کی بات نہیں کرنی چاہیے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۱۱ جنوری ۲۰۱۹ء

کیا اسرائیل کو تسلیم کرلینا چاہیے؟

مجلہ :

ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ

تاریخ اشاعت :

ستمبر ۲۰۰۳ء

محترمی جاوید چودھری صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ مزاج گرامی؟

اسرائیل کے ساتھ تعلقات کے بارے میں ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ صاحب کے ارشاد کے حوالہ سے آپ کا کالم نظر سے گزرا۔ میری طالب علمانہ رائے میں ڈاکٹر صاحب علیہ الرحمۃ کا ارشاد بالکل بجا ہے کہ قرآن کریم کی جس آیت کریمہ میں یہود ونصاریٰ کے ساتھ "ولایت" کے درجہ کی دوستی سے منع کیا گیا ہے، وہ یہود ونصاریٰ کے ساتھ معمول کے تعلقات میں رکاوٹ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسیحی ممالک کے ساتھ تعلقات اور معاملات میں ملت اسلامیہ نے کبھی ہچکچاہٹ سے کام نہیں لیا اور خلافت راشدہ سے لے کر اب تک مسیحی ملکوں کے ساتھ ہمارے تعلقات اور معاملات مسلسل چلے آرہے ہیں۔ البتہ یہودیوں کی دو ہزار سال بعد تشکیل پانے والی ریاست "اسرائیل" کے ساتھ تعلقات کا مسئلہ قدرے مختلف نوعیت کا ہے اور اس کی وجہ یہ آیت کریمہ نہیں، بلکہ اگر اس آیت کریمہ کو اسرائیل

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کے ساتھ سفارتی تعلقات کی ممانعت میں پیش کیا جائے تو میرے خیال میں یہ خلط مبحث ہو گا اور مسئلہ کو زیادہ الجھا دینے کی صورت ہو گی۔ اسرائیل کو تسلیم کرنے اور اس کے ساتھ سفارتی تعلقات سے اختلاف کی وجوہ مختلف ہیں۔

1. مثلاً سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ فلسطین میں یہودیوں کی آباد کاری وہاں کی صدیوں سے چلی آنے والی آبادی یعنی فلسطینیوں کی رضامندی کے ساتھ نہیں ہوئی، بلکہ پہلے برطانیہ نے اس خطہ پر ۱۹۱۷ء میں باقاعدہ قبضہ کر کے فوجی طاقت کے بل پر یہودیوں کو فلسطین میں آباد کیا ہے، اور اب امریکہ اور اس کے اتحادی پوری فوجی قوت استعمال کر کے فلسطینیوں کو یہودیوں کی اس جبری آباد کاری کو تسلیم کرنے پر مجبور کر رہے ہیں جس پر فلسطینی راضی نہیں ہیں کیونکہ یہ دھونس اور جبر کا راستہ ہے جسے دنیا کی کوئی مہذب اور متمدن قوم قبول نہیں کر سکتی۔ میرا خیال ہے کہ جس طرح ہم کشمیر کے بارے میں اصولی موقف رکھتے ہیں کہ بھارتی فوج وہاں سے چلی جائے اور کشمیریوں کو کسی دباؤ کے بغیر اقوام متحدہ کے نظم کے تحت اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا موقع دیا جائے، اسی طرح فلسطین بلکہ پورے مشرق وسطیٰ کے بارے میں ہمارا اصولی موقف یہ ہونا چاہیے کہ امریکہ اپنی فوجیں اس خطہ سے نکالے اور نہ صرف فلسطین بلکہ خلیج کے دیگر ممالک کو بھی فوجی دباؤ سے آزاد کر کے وہاں کے عوام کو اپنے مستقبل کا فیصلہ خود کرنے کا آزادانہ موقع فراہم کرے۔ انصاف اور مسلمہ اصولوں کا تقاضا تو بہر حال یہی ہے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اور اگر بالادست قوتیں طاقت کے نشے میں اس اصول پر نہیں آتیں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم اپنے موقف سے دستبردار ہو جائیں اور بے اصولی اور دھونس کو اصول و قانون کے طور پر تسلیم کر لیں۔

2. پھر اسرائیل کو تسلیم کرنے میں ایک عملی رکاوٹ یہ بھی ہے جسے دور کیے بغیر اسے تسلیم کرنا قطعی طور پر ناانصافی کی بات ہو گی۔ وہ یہ کہ اسرائیل کی سرحدی حدود اربعہ کیا ہیں؟ یہ بات ابھی تک طے نہیں ہو سکی۔ بہت سے عرب ممالک اور فلسطینی عوام کی اکثریت سرے سے فلسطین کی تقسیم کو قبول نہیں کر رہی۔ اقوام متحدہ نے اسرائیل اور فلسطین کے درمیان جو سرحدات اپنی قراردادوں میں طے کر رکھی ہیں، انہیں اسرائیل تسلیم نہیں کر رہا۔

- اسرائیل کی اقوام متحدہ کی طرف سے طے کردہ سرحدات اور ہیں،
- اس وقت اس کے زیر قبضہ علاقے کی حدود اربعہ اور ہیں،
- کسی اصول اور قانون کی پروا کیے بغیر پورے فلسطین میں دندناتے پھرنے سے اس کی سرحدوں کا نقشہ بالکل دوسرا دکھائی دیتا ہے،
- اور اسرائیلی حکمرانوں کے عزائم پر مشتمل "عظیم تر اسرائیل" کا جو نقشہ ریکارڈ پر موجود ہے، وہ ان سب سے مختلف ہے۔
- اس کے ساتھ اسرائیلی وزیر اعظم شیرون کا یہ اعلان کئی بار سامنے آ چکا ہے کہ وہ فلسطین کی مجوزہ ریاست کو صرف اس شرط پر تسلیم کریں گے کہ اس کی سرحدات کا تعین نہیں ہو گا اور اس کی الگ فوج نہیں ہو گی۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہے کہ اسرائیل پورے فلسطین پر حکمرانی کے حق کا اعلان کر رہا ہے اور فلسطینیوں کو سرحدات کے تعین کے ساتھ کوئی چھوٹی سی برائے نام ریاست دینے کے لیے بھی تیار نہیں ہے۔

3. اس کے ساتھ اسرائیل کو تسلیم کرنے سے قبل آپ کو بیت المقدس کے بارے میں بھی اپنے موقف پر نظر ثانی کرنی ہو گی اور اس کی دو ہی صورتیں ہیں کہ یا تو اسرائیل کو بیت المقدس سے دستبرداری پر آمادہ کر لیں اور یا خود "یوٹرن" لے کر بیت المقدس سے دستبرداری کا فیصلہ کر لیں۔

یہ تینوں رکاوٹیں جن کا میں نے ذکر کیا ہے، پریکٹیکل ہیں، عملی ہیں اور معروضی ہیں، ان کا کوئی باوقار اور قابل عمل حل نکال لیں اور بے شک اسرائیل کو ایک یہودی ریاست کے طور پر اسی طرح تسلیم کر لیں جس طرح ہم بہت سے مسیحی ممالک کو تسلیم کرتے آ رہے ہیں۔ میرے خیال میں اس حوالے سے بات عملی مسائل پر ہونی چاہیے اور معروضی حقائق پر ہونی چاہیے، نظری اور علمی مباحث میں الجھا کر اس مسئلہ کو مزید پیچیدہ نہیں بنانا چاہیے۔

شکریہ! والسلام

ابو عمار زاہد الراشدی

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "